رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰

جمادی الاخر ۱۳۷۴ھ

جلد ۴۳ عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ — لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

تفہیم القرآن

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شاہکار تفسیر قران

قرآن پوری انسانیت کے لئے ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ ہے' لیکن جب تک ہر زبان میں اسی زور بیان' طرز استدلال اور حسن ادب کو منتقل نہ کیا جائے ہر شخص کی روح کی گہرائیوں میں قرآن کو نہیں اتارا جا سکتا -

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اردو زبان میں قرآن پاک کا نہایت سلیس' با محاورہ اور عام فہم ترجمہ (بلکہ ان کے اپنے ہی لفظوں میں ترجمانی) کرکے ایک بڑی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے - ترجمے کے ساتھ ساتھ مولانائے موصوف نے ہر سورت کے آغاز میں اس کا زمانہ نزول' تاریخی پس منظر اور مرکزی مضمون کا خلاصہ دے دیا ہے - اس کے علاوہ ہر ایسے مقام پر جہاں قاری کے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہوسکتا ہے یا کوئی ابہام و تشنگی محسوس ہوتی ہے - مولانائے ربط کلام کو واضح کرتے ہوئے نہایت تفصیل کے ساتھ ایسی ہر الجھن کو دور کر دیا ہے - قرآن کی اسلامی دعوت کو سمجھنے کے لئے تفہیم القرآن کا مطالعہ نا گزیر ہے -

جلد اول

الفاتحہ — الانعام

قسم اول ۱۲/۲۰ قسم دوم ۴/۱۸

جلد دوم

الاعراف — بنی اسرائیل

چھپ چکی ہے اور جلد بندی ہوتے ہی فرمائشوں کی تعمیل شروع کر دی جائیگی -

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ — لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۳ | جمادی الاخریٰ ۱۳۷۴ھ - مطابق مارچ ۱۹۵۵ء | عدد ۶

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

پاکستان جس معاشرے اور جس سیاسی ہیئت کا نام ہے وہ کسی انقلابی تحریک کا نتیجہ نہیں ہے کہ کوئی ایک اصولی طاقت یا کوئی ایک طبقاتی عنصر دوسری ہر طاقت کو توڑ پھوڑ کر فتح مندانہ شان سے ابھرا ہو اور خالص اپنے تقاضوں کے تحت ایک دستور بنا کر اسے نافذ کر دے۔ اس کے برعکس اس کا وجود قطعی طور پر تاریخ کے تدریجی تغیرات کا مرہونِ منت ہے۔ ایسی حالت میں صرف ایک تعمیری دستور کا بننا اور چلنا ممکن ہو سکتا ہے جو معاشرے کے عمومی رجحانات کے تحت مختلف مدارسِ فکر اور طبقات و عناصر کو کسی ایک نقطۂ مفاہمت پر جمع کرتا ہوا تدریجی اصلاح و تغیر کے لیے فضا کو سازگار بنا سکے۔ یہ نقطۂ مفاہمت تلاش کرنا اور اس پر مختلف عناصر کو مجتمع کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمارے ہاں اسی نقطۂ مفاہمت کی تلاش نے دستور سازی میں اتنا وقت[1] لگا دیا ہے کہ شاید اس کی مثال تاریخِ اقوام میں اور کہیں نہیں ملے گی۔ لیکن یہ تھا ناگزیر!

ایک طرف یہاں مسلم اکثریت ہے جس کی ہیئتِ اجتماعی کی بنیاد ہی اسلام پر استوار ہوتی ہے اور جو اسلام ہی کے نصب العین کو لے کر تحریکِ پاکستان کی منازل طے کرتی ہوئی آزادی کی منزل تک پہنچی ہے اور اب وہ اسلامی نظامِ حیات کا نقشہ سامنے رکھ کر تعمیرِ نو کرنا چاہتی ہے، لیکن دوسری طرف اسے غیر مسلم اقلیتوں کے مسئلے سے سابقہ درپیش ہے جس میں جو موقف اختیار کیا جائے وہ پوری بین الاقوامی فضا میں اچھا یا برا ردِ عمل دکھا سکتا ہے۔ اسی طرح یہاں ایک گروہ ایسا موجود ہے جو آنکھوں پر پٹی باندھ کر مغربیت کی راہ پر جانا چاہتا ہے اور اس رجحان میں اتنا انتہا پسند ہے کہ اسے اسلام، قرآن اور سنت کے الفاظ تک سے چڑ ہے، لیکن دوسری طرف یہاں مذہبی دائرے میں ایسے ذہن بھی موجود ہیں

---

[1] اس مدت کی غیر معمولی طوالت کا ایک بڑا سبب مفاد پرست طاقتوں کی باہم آویزی ہے

جو آج کے حالات، تقاضوں، ذرائع و وسائل، مسائل و معاملات سے بالکل بے تعلق رہتے ہوئے صدیوں پہلے کے ماحول میں سوچتے ہیں اور قرنوں پرانی اصطلاحات میں بات کہتے اور سمجھتے ہیں اور نیک نیتی سے اپنے جامد تصورات کو آج کی متحرک تاریخ میں نصب کرنا چاہتے ہیں۔ ان دو متضاد رجحانات کے درمیان تیسرا معتدل رجحان ہے جو یہ تقاضا کرتا ہے کہ اسلام کے اصول اور تقاضوں کو جدید حالات میں جدید ادارات کا قالب دے کر نصب کیا جائے اور جدید ذرائع و وسائل سے ایک مجتہدانہ طرزِ فکر کے ساتھ اس کے قیام و فروغ کی خدمت لی جائے۔ اور یہی وہ رجحان ہے جو رائے عام کو متاثر کر رہا ہے۔ پھر یہاں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ہر حال میں اقتدار کو اپنی اجارہ داری میں رکھنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے اپنے موجودہ معمول کے مطابق مستبدانہ اختیارات اور تشدد دانہ قوانین کے استعمال کی راہیں آئندہ دستوری ہیئت میں بھی کھلی رکھنا چاہتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ صاف صاف طریق سے اپنی آمریت قائم کر دینے پر تُلا بیٹھا ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل عوامی رجحانات پورے پورے جمہوری اور شہری حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں اور کسی کی خداوندی کا جُوا اٹھانے پر تیار نہیں ہیں۔ پھر اس ملک میں یہ کشمکش بھی موجود رہی ہے کہ ایک طرف مرکز کو کنٹرول کرنے والے ہاتھ صوبائی طاقتوں کو اپنے قابو میں رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف صوبائی طاقتیں مرکز کے مقابلے میں اپنے قدم جمائے رکھنے کی حریص ہیں۔ اسی طرح کچھ حقیقی اسباب کے تحت اور کچھ غلط کار لیڈروں اور تنظیموں کی مفاد پرستانہ سیاست کے زیرِ اثر پاکستان کے مشرقی اور مغربی بازوؤں میں مفاد کی کشمکش کارفرما ہو گئی ہے۔

ان سارے عوامل کے تحت مختلف عناصر میں جو کشمکش موجود تھی اور جسے بندگانِ مفاد کی گروہ بندیوں نے ایک فاسد مزاج دے دیا ہے، یہی وہ بلا تھی جس نے دستور سازی کے کام کو بار بار تعطل و التوا میں ڈالا اور بار بار اس میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔ اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر مارچ ۱۹۴۹ء تک بڑی مشکلوں سے مختلف رجحانات کا سمجھوتہ ایک قرار دادِ مقاصد پہ ہو سکا۔ پھر مارچ ۱۹۴۹ء سے نومبر ۱۹۵۲ء تک کے دور میں بڑی کاوشوں کے بعد بنیادی اصولوں کی رپورٹ پر فی الجملہ اتفاقِ رائے پیدا ہوا لیکن پھر ہمارے اربابِ اقتدار کو پارلیمانی نشستوں کے بٹوارے کا مسئلہ لے کے بیٹھ گیا۔ آخر محمد علی فارمولا پہ

یہ قضیہ طے ہوا۔ اس کے بعد گورنر جنرل اور وزارت کے اختیارات کی رسہ کشی سے سابقہ پڑا۔ گذشتہ ستمبر میں پروڈا کی تنسیخ اور گورنر جنرل کے اختیارات کی قطع و برید عمل میں آئی۔ اِن منازل ہفت خواں سے گزرنے کے بعد اب مسودۂ دستور تکمیلی دَور میں آپہنچا تھا اور گنتی کے چند روز اس کی منظوری اور نفاذ میں باقی تھے کہ دستوریہ کی لبِ بام پہنچی ہوئی کمند پہ گورنر جنرل کے فرمانِ اکتوبر کا وار چل گیا اور ملک نامعلوم مدت کے لیے دستور سے محروم ہو گیا۔

پاکستان کے "انقلاب اکتوبر" کا اثر اتنا ہی نہیں تھا کہ دستوریہ کے کام میں تعطل پیدا ہو گیا اور سات برس کی محنتوں کے بھلے یا بُرے ثمرے سے قوم محروم رہ گئی، بلکہ عملاً نئی صورتِ حالات نے آمریت اور فوجی اقتدار کے خطروں کو قصرِ سیاست و اقتدار کے دروازے پر لا کھڑا کر دیا۔ دستوریہ کے ساتھ ساتھ سرے سے دستوریت (CONSTITUTIONALISM) خطرے میں پڑ گئی۔ جو لوگ دستوریہ کے خلاف سیاسی پروپیگنڈوں کا طوفان اٹھا رہے تھے جب نئی صورتِ حالات سامنے آئی تو ان کی بھی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ یہ کیا ہو گیا اور یہ کیا ہونے والا ہے!

دستوریت کی اہمیت کیا ہے؟

جس طرح افراد کو قانون (اخلاقی و عدالتی) ایک دوسرے کے مقابلے میں دھاندلی سے باز رکھتا ہے اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے جنگلی فارمولے کو نہیں چلنے دیتا، بلکہ وہ ان میں حالتِ امن قائم رکھتا ہے ٹھیک اسی طرح حکومت اور اس کے مختلف اداروں اور حکمراں طبقے اور عوام کے درمیان دستوریت ایک منصفانہ توازن قائم کر کے قوت کو حق کی بنیاد بننے سے روکتی ہے اور اجتماعی نظام کو حالتِ امن میں رکھتی ہے۔ ایک بار دستوریت متزلزل ہو جائے تو پھر سوسائٹی کے مختلف مناصب اور اداروں کے درمیان حقوق و فرائض کی کوئی بھی تقسیم مستقل نہیں رہ سکتی۔ صدہا صدیوں کے تلخ تجربات کے بعد دورِ حاضر کی اجتماعی ہیئتوں نے دستوریت کو اپنے لیے لازم ٹھہرایا ہے، لیکن اسلام نے اپنی ہیئت کی بنیاد اوّل روز سے وحیِ الٰہی کی روشنی میں دستوریت پر رکھی ہے۔

دستوریت میں رخنہ پیدا ہو جانے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک ملک میں کسی کے کوئی متعین حقوق باقی نہیں رہتے اور نہ کسی کے اختیارات محدود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں لادستوری نظام گویا ایک اندھی نگری ہے جس میں جو زور و قوت رکھتا ہو وہ جو چاہے کر گذرے۔ پولیس، فوج، عدالت، ہیڈ آف دی اسٹیٹ، وزارت، پارلیمنٹ (اگر باقی رہ جائے تو) جس موقع پر جس طرح کی سازش چاہے کرے اور اس کے نتیجے میں جو اقدام کر گذرے سو روا ہے۔ لادستوری حالت کی مثال گویا بازارِ سیاست میں چور بازار کی سی ہے۔ جو جس کی گرہ کاٹ سکتا ہو، ہاتھ کی صفائی کی کمائی کھا سکتا ہے یہ حالت جب پیدا ہو جاتی ہے تو سیاسی نظم کا استقلال (STABILITY) بالکل ختم ہو جاتا ہے کسی کو کوئی اندازہ نہیں ہوتا کہ صبح کے شام ہونے تک اور شام کے سحر ہونے تک کونسا نیا حادثہ یکایک واقع ہو جائے گا۔ رائے عام کی مداخلت سے حکومت آزاد ہو جاتی ہے اور چند افراد لاکھوں انسانوں کے قسمت گر بن جاتے ہیں۔ حکومت کے تمام اونچے اربابِ اقتدار، تمام ادارے اور مناصب اور تمام محکمے ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں لگ جاتے ہیں اور تعمیر و ترقی یکسر رک جاتی ہے بین الاقوامی حیثیت سے ملک کی ساکھ تباہ ہو جاتی ہے اور دوسری قومیں ایسے فساد زدہ نظام پر اعتماد نہیں کر سکتیں سیاسی پارٹیوں کے لیے عوام میں کام کرنا ممکن نہیں رہتا اور اس طرح سیاسی ارتقاء رک جاتا ہے۔ پھر چونکہ لوگ ایسی نامطلوب حالت کو بدلنے کے لیے جائز راستہ نہیں پاتے اس لیے ان کے سیاسی رجحانات بدراہ ہو جاتے ہیں۔ علاوہ بریں جس ملک میں دو چار افراد کی خدائی چل رہی ہو اور سازشوں کی فضا میں ہر خدائی چار دن کی خدائی ہو، وہاں باہر کی امپیریلیسٹ طاقتوں کو اثر و نفوذ کے راستے کھلے مل جاتے ہیں۔

لادستوریت کے اس مہلک جہنم میں قوموں کو ہمیشہ ایسے لوگ دھکیلتے ہیں جن کو اپنی قوموں کے نفع و نقصان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنے (یا کبھی کبھی اپنے گروپ کے) اقتدار کے لیے ایسے خوفناک نتائج رکھنے والی چالیں چل جاتے ہیں۔ خصوصاً جو لوگ چلتی ہوئی جمہوریت کے اندر آمریت کو منزل مقصود

بنا کر اقدام کرتے ہیں ان کا مرحلۂ اول یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اٹھا کر دستور سے بلند و بالا کرتے ہیں اور پھر پہلا موقع پاتے ہی دستوریت کے گلے پر چھری پھیر دیتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ اس کارنامے کا احسان قوم اور عوام کے سر دھرتے ہیں۔ اس کی بے شمار تاریخی مثالوں میں سے ایک مثال ہٹلرازم کی ہے۔ اکثریت کے ووٹ کسی نہ کسی طرح مار کے جانے کے بعد جب نیشنل سوشلسٹ گروپ آگے آگیا تو ۱۲ مارچ کو ریشتاغ کے ممبروں کا ایک خصوصی اجلاس طلب کیا گیا اور اس میں بائیں بازو کی پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے ارکان کو سرے سے دعوت ہی نہیں دی گئی۔ اسی میں ہٹلری حکومت کے نصب کا اعلان ہوا۔ ۲۳ مارچ کو اس اعضا بریدہ پارلیمنٹ کا اجلاس ہوتا ہے جس میں کمیونسٹ اور سوشل ڈیموکریٹ ممبروں کی ایک بڑی تعداد جیل میں ہونے یا ملک سے باہر چلے جانے کی وجہ سے حصہ لینے سے محروم تھی۔ اس ریشتاغ سے ہٹلری حکومت نے آمرانہ اختیارات کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ چار سال کے لیے ریشتاغ حکومت کو قانون سازی کے اختیارات دے کر پیچھے ہٹ گئی۔۔۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تغیر جس "قانون آمریت" (ENNABLINGLAW)

کے ذریعے واقع ہوا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ قانون سازی صرف دستور کے متعین اسلوب پر ہی کرنا ضروری نہیں بلکہ ریش گورنمنٹ خود بھی قانون بنا سکتی ہے اور ریش گورنمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین دستور سے منحرف بھی ہو سکتے ہیں۔ ہٹلر نے اعلان کیا کہ مامور شدہ وزراء غیر معین مدت کے لیے کام کرتے رہیں گے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آمریت کا راستہ ہی لادستوریت ہے، چاہے جرمنی میں اٹھے، ترکیہ میں، مصر میں یا کسی اور سرزمین میں!

زندہ رائے عام ہی ایک طاقت ہے جو اس بلائے بے درماں سے سوسائٹی اور سیاسی ہیئت کو بچا سکتی ہے۔ لیکن رائے عام کے علی الرغم یہ تلوار اگر کسی معاشرے کے سر پر لٹک جائے تو اس کے وار کو روکنے میں عدلیہ بڑا پارٹ ادا کر سکتی ہے۔ چنانچہ جمہوریت کی تاریخ میں عدلیہ نے جمہوری قدروں اور عوام کے حقوق کو غاصبوں سے بچانے کے لیے بڑے نزدین کارنامے پیش کیے ہیں۔ لیکن عدلیہ بھی آمریت کے خطرے کے مقابلے میں کوئی نتیجہ خیز کارنامہ جبھی سرانجام دے سکتی ہے کہ رائے عام دستوریت اور قانون کے احترام کی محافظ ہو۔

یہ اللہ کا فضل ہے کہ آمریت نے ہمارے دروازے پر اولین دستک دی تو رائے عام نے اس کا خیر مقدم

ایک جذبۂ نفرت سے کیا پھر اس قضایا میں سندھ چیف کورٹ نے جو فیصلہ دستوریہ اور حکومت کا اختلاف رفع کرنے کے لیے صادر کیا ہے (قطع نظر اس کی قانونی حیثیت کے، کیونکہ یہ حیثیت تو اب فیڈرل کورٹ میں زیر بحث ہے)۔ سیاسی لحاظ سے وہ دستوریت و جمہوریت کی آبرو کو بچانے والا فیصلہ ہے، اور اس فیصلے نے ہماری عدلیہ کو ایک تاریخی مرتبہ دے دیا ہے۔ ان اچھے شگونوں کے ہوتے ہوئے ہم پُر امید ہیں کہ یہاں انشاء اللہ آمرانہ رجحانات کو کچھ زیادہ آگے بڑھنے کا موقع نہیں ملے گا۔

اب فیڈرل کورٹ میں اس مقدمے کی کارروائی کے دوران میں یکایک فریقین کے درمیان مصالحت کی تحریک شروع ہو گئی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ملک کو از سر نو دستوریت کی راہ پر ڈالنے کی صرف یہی ایک صورت باقی ہے۔ کیونکہ فیصلہ اگر دستوریہ کے خلاف اور گورنر جنرل کی پوزیشن کے حق میں جاتا ہے تو دستوریہ کا اب تک کا کیا کرایا آئینی قدر و قیمت کھو بیٹھے گا اور اس سے بڑی بھاری ملکی اور بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں جن کا حل آسان نہیں۔ اور فیصلہ اگر دستوریہ کے حق میں جاتا ہے تو گورنر جنرل اور موجودہ وزراء پر ایک ایسی غیر آئینی حیثیت چپک جائے گی جسے کوئی بھی اپنے لیے پسند نہیں کر سکتا۔ اس صورت میں ملک کی قسمت دستوریہ کی قانونی پوزیشن اور حکومت کے عملی اختیارات کے درمیان اسی طرح لٹک جاتی ہے جیسے وہ برطانیہ میں بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان ایک بار معلق ہو گئی تھی۔ پس راہِ نجات اب مصالحت ہی ہے، بشرطیکہ فریقین ذہانت اور فراخ دلی سے کام لیں اور ذاتی اور گروہی مفاد کے بجائے ملکی مفاد کو پیش نظر رکھیں۔

مصالحت کی جو صورت بطور تجویز سامنے آئی ہے اُس پر سوچنے سے قبل ایک اور تجویز بھی زیر غور لائی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ جو مسودۂ دستور ہفت سالہ صرفِ قوت و مال سے ایک مناسب شکل اختیار کر چکا ہے، ایک بار اُس پر بھی تو نگاہ ڈال لی جائے کہ آیا وہ کسی قدر ردّ و بدل کے ساتھ فریقین کے لیے قابلِ قبول ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس کا اسلامی عنصر تو چند کوتاہیوں کے باوجود (جن کو پورا کیا جا سکتا ہے) پوری قوم کا متفق علیہ ہے۔ لے دے کر ایک مسئلہ مغربی پاکستان کے ایک یونٹ بنانے کا ہے اور دوسرا شاید گورنر جنرل کے اختیارات کا ہو، تو کیوں نہ ان دونوں مسائل میں مفاہمت کر کے پیش نظر مسودہ کو نئی

صورت لے لی جائے اور ایک آدھ مہینے کے بعد اسے نافذ کر دیا جائے۔ اس سے ملک الیکشن کے مصارف اور وقت کے ضیاع سے بھی بچ جائے گا اور موجودہ ادھ کچری حالت سے بھی ایک ہی جست میں نکل سکے گا۔ اصل شے تو دستور ہے، اگر وہ ہماری ضروریات کو پورا کر دے تو آخر اس صنم صندا کی کیا وجہ کہ یہ دستور یہ نہ ہو، لازماً ایک نئی دستور یہ ہی بنے۔ موجودہ دستور یہ کے کٹر مخالفین میں سے نمایاں ترین ہستی وزیر قانون مسٹر سہروردی کی ہے لیکن ان کا بھی حال یہ ہے کہ وہ چند نامزد وزراء کا ایک کمرے میں بیٹھ کر بنایا ہوا دستور قبول کر سکتے ہیں تو پھر موجودہ دستور یہ اس وزارت سے زیادہ غیر نمائندہ تو نہیں۔

لیکن اگر یہ تجویز معقول وجوہ کی بنا پر قابل قبول نہ ٹھہرے تو پھر مفاہمت کسی ایسی صورت پر ہونی چاہیے جس کے ذریعے واقعی ایک نمائندہ تر دستور یہ کا انتخاب[1] فوراً عمل میں آئے۔ یہ نہ ہو کہ موجودہ دستور یہ نئی دستور یہ کے انتخاب کا کام حکومت کو سونپ کر خود مستعفی ہو جائے اور پھر کوئی ایسی ایمرجنسی پیدا ہو کہ حکومت انتخابات کو ٹال دے اور وہی خطرناک دستوری خلاء پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے آج ہم گوناگوں الجھنوں سے دوچار ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ موجودہ دستور یہ دستور سازی کا کام روک دینے کے فیصلے کے ساتھ ایک قانون کے ذریعے اپنے آپ کو انتخاب کرانے والی مشینری میں بدل دے اور پولنگ کی آخری تاریخ کا قطعی تعین کر دے، اور یہ بھی طے کر دے کہ جونہی نئی دستور یہ کا پہلا اجلاس منعقد ہوگا یہ آٹومیٹک طریق پر موقوف ہو جائیگی۔ اس صورت میں اگر انتخابات کسی وجہ سے موخر ہوئے تو ساورن باڈی موجود رہے گی۔ بخلاف اس کے اگر دستور یہ موجودہ حکومت کو اپنا جانشین بنا کر رخصت ہو گئی تو پھر کوئی نہیں جانتا کہ ملک کو کیسے مستقبل کا سامنا کرنا ہوگا۔

ہم ہر لحاظ سے بہتر تو یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ مسودۂ دستور پر مفاہمت ہو جائے، لیکن اگر یہ نہ ہو سکے تو ہم بڑی مسرت کے ساتھ نئی دستور یہ کے ڈائرکٹ انتخابات کا خیر مقدم کریں گے۔ ڈائرکٹ انتخابات ہوں تو دستور سازی کی مہم از سر نو رائے عام سے مربوط ہو جاتی ہے، اور معاملات اگر رائے عام کے زیر اثر آ جائیں تو پھر مفاد پرستانہ ریشہ دوانی

[1] یہ انتخاب موجودہ اسمبلیوں کے واسطے سے نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ ایک تو خود ان کی نمائندہ حیثیت قابل بحث ہے۔ دوسرے ان کا انتخاب دستور سازی کی ضرورت کو سامنے رکھ کر نہیں کرایا گیا۔

اِسلام اور ہمارا قانونی نظام

عبد القادر عودہ شہید

(۴)

شہری آزادیوں سے محرومی اسی طرح امپیریلسٹ طاقتوں کے اشارے پر ہماری حکومتیں نقل و حرکت، اجتماع اور تحریر پر پابندیاں عائد کرتی ہیں۔ ایک اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک میں جانے پر چند در چند پابندیاں عائد ہیں، بلکہ ایک ہی ملک میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا دشوار ہے۔ مثلاً مصر سے سوڈان جانا یا شمالی سوڈان سے جنوبی سوڈان جانا آسان کام نہیں ہے۔ جلسے، جلوس، پریس، مطبوعات اور تنظیمات کی تشکیل کے بارے میں اب تک وہی قوانین چل رہے ہیں جو مدتوں پہلے اجنبی فرمانرواؤں کے مفادات کو سامنے رکھ کر بنائے گئے تھے، اور جن کے ذریعے سے قوم کو حریت و مساوات سے محروم کر کے غلامی کے شکنجے میں جکڑ دیا گیا تھا۔ اسلحہ کے بارے میں یہاں اس طرح کے قوانین نافذ ہیں جن کی بنا پر اسلحہ کی خرید و فروخت، ان کے رکھنے اور استعمال کرنے پر طرح طرح کی پابندیاں لگا دی گئی ہیں۔ اس کا مقصد اور نتیجہ سوا اس کے اور کیا ہے کہ ہم نہتے، کمزور اور اسلحہ کے استعمال سے بے خبر رہیں حالانکہ دشمن کے خلاف جہاد کرنا اور اُس سے لڑ کر اُسے اپنے وطن سے نکال باہر کرنا ہم پر فرض ہے۔

یہ ہیں وہ اصول فاسدہ جن پر ہمارے قانون کی بنیاد استوار کی گئی ہے اور جن پر اصول صالحہ کو قربان کر دیا گیا ہے۔ ان سے ہماری دنیا بھی بگڑ رہی ہے اور عاقبت بھی خراب ہو رہی ہے۔ ان سے شر، فتنہ اور فساد پروان چڑھ رہا ہے۔ فقر، فاقہ، غلامی اور رسوائی چار سو پھیل رہی ہے۔ یہ ہمارے قوانین نہیں ہیں، ہمارے دشمنوں کے قوانین ہیں۔ یہ طوق و سلاسل ہیں جن کی مدد سے اغیار نے ہمیں مقید کر رکھا ہے۔ یہ ہماری کتنی بڑی بدبختی ہے کہ بغیر کسی جائز اور صحیح نسبت کے انہیں ہماری طرف

منسوب کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ قوانین ہمیں کفر وفقر کی آغوش میں دھکیل رہے ہیں اور ہماری قومی تباہی اور انتشار کا موجب بن رہے ہیں۔

قانون کو غلبہ و تسلط کب حاصل ہوتا ہے؟ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ معنوی اور حقیقی اعتبار سے قانون ایک ایسی ضرورت ہے جس سے جماعت کو مفر نہیں ہے۔ قانون کے بل پر ہی معاشروں کی تنظیم، مظالم کا انسداد اور حقوق کا تحفظ عمل میں لایا جاتا ہے۔ قانون ہی کی وساطت سے اجتماعی عدل وانصاف کا قیام ممکن ہوتا ہے اور اقوام عالم کی رسائی خیر وکمال کی منزل تک ہوتی ہے۔ ان اعلیٰ اور اشرف مقاصد کے حصول کی خاطر یہ امر ناگزیر ہوتا ہے کہ قانون کو باقاعدہ اور تحریری متون، دفعات اور الفاظ کے سانچے میں ڈھالا جائے تاکہ روح قانون تحریف، انحراف اور نسیان کا شکار نہ ہونے پائے۔ گویا کہ قانونی نظام کے بھی جسمانی نظام کی طرح دو پہلو ہیں۔ ایک اس کی روح ہے اور ایک اس کا جسم ہے۔ قانون کے اندر جو معنویت کارفرما ہوتی ہے اور جو افراد قوم سے اپنے غلبے اور اپنی بالادستی کو تسلیم کراتی ہے وہ درحقیقت روح قانون ہے اور الفاظ کا جامہ جو قانون کو پہنایا جاتا ہے وہ گویا کہ جسد قانون ہے۔ جس قانونی ڈھانچے کو دل ودماغ پر معنوی اور باطنی غلبہ واقتدار حاصل نہ ہو وہ ایک مردہ اور بے روح جسم کی مانند ہے۔ تحریری انضباط اور کاغذ پر لکھے جانے کے باوجود اس قانون کی قدر وقیمت اس کاغذ کے برابر بھی نہیں جس پر یہ لکھا گیا ہے۔ قانون کی صلاحیت وافادیت کا اصل انحصار اسی غلبہ وگرفت پر ہے۔ یہ گرفت جتنی قوی ہوگی قانون بھی اتنا ہی طاقتور ہوگا اور یہ گرفت جتنی کمزور اور ڈھیلی ہوگی قانون بھی اتنا ہی ضعیف اور بودا ہوگا۔

اس غلبہ وتسلط کو وجود میں لانے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے دو اسباب کی کارفرمائی ضروری ہے۔ پہلا سبب خالص روحانی اور اخلاقی نوعیت رکھتا ہے اور یہ قانون کی تقدیس واحترام کا وہ جذبہ ہے جو قانون کی اطاعت کرنے والوں کے قلوب میں جاگزیں ہوتا ہے۔ اس جذبے کا ہی یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ قانون کے سامنے سر ہی نہیں بلکہ دل بھی جھک جاتے ہیں۔ جہاں یہ جذبہ موجود ہوتا ہے وہاں قانون کی پیروی مارے باندھے اور کسمساتے ہوئے نہیں کی جاتی، بلکہ اس کا استقبال پوری خوش دلی اور نفس کی

آمادگی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اس کی خلاف ورزی کو گناہ اور اخلاقی جرم خیال کیا جاتا ہے۔ یہ پسندیدہ صورتِ حال اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک کہ قانون کی بنیاد ایسے عقائد پر نہ رکھی جائے جن پر عوام الناس کا ایمان ہو یا ایسے اصول و مبادی پر نہ رکھی جائے جن کا اکرام و احترام لوگوں کے دلوں میں موجود ہو۔ قانون کے غلبہ و تسلط کا دوسرا باعث وہ جبر و اکراہ ہے جو نفاذِ قانون کے لیے عمل میں لایا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک خارجی عنصر ہے جو اپنی کارفرمائی کے لیے قانون سازوں اور حکمرانوں کے وجود کا محتاج ہے۔ اس میں وہ سزائیں، تعزیرات اور جرمانے وغیرہ بھی شامل ہیں جو قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں پر عائد کیے جاتے ہیں۔

قانون کی اقسام اس طرح کے غلبہ و تسلط کے نقطۂ نظر سے اگر دنیا کے قانونی نظاموں پر نگاہ ڈالی جائے تو ہمیں کئی قسم کے مجموعہ ہائے قوانین نظر آتے ہیں۔ ایک قسم کے قوانین وہ ہیں جن کے حق میں باطنی اور ظاہری، روحانی اور مادی دونوں قسم کی بالادستی کے اسباب کام کرتے ہیں۔ قوانین کی یہ قسم اپنے اندر نفاذ و انفاذ کی بہترین صلاحیت رکھتی ہے اور معاشرے پر اس کی گرفت نہایت مضبوط ہوتی اس طرح کا قانون چونکہ عوام کے دل کی آواز ہوتا ہے اور ان کے عقائد و نظریات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے اس لیے خارجی دنیا کے ساتھ ساتھ دلوں کی دنیا میں بھی اسی کا سکہ چلتا ہے۔ اس طرح ظاہر اور باطن میں کامل یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ قانون بھی ہم سے انہی امور کا تقاضا کرتا ہے جن امور کا تقاضا ہمارے دینی و اخلاقی معتقدات کرتے ہیں۔ خلوت ہو یا جلوت، تنگی ہو یا آسانی، اس طرح کے قوانین کی بہرحال اطاعت کی جاتی ہے، اور پورے شرح صدر کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اگر ہم ان قوانین کے مقتضیات کو پورا کرتے ہیں تو ہمیں دلی اطمینان نصیب ہوتا ہے اور اگر ہم سے ان کی خلاف ورزی سرزد ہوتی ہے تو ضمیر ہمیں ملامت کرتا ہے۔

اس قسم کے قوانین کی بہترین مثال شریعتِ اسلامی کے قوانین ہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ بعض انسان کے وضع کردہ قوانین بھی اس شمار میں آ سکتے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی قوانین اور خدائی قوانین میں بعض دوسرے بنیادی اختلافات موجود ہیں۔

انسانی قوانین اور الٰہی قوانین قوانینِ شرعیہ کا اوّلین اور مابہ الامتیاز پہلو یہ ہے کہ ان کے ساتھ ایک روحانی برتری اور تقدس کا ایک عنصر وابستہ ہے جو انسانوں کے وضع کردہ کسی بھی مجموعۂ قانون کے ساتھ وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ شریعت کا ہر قانون اسلامی تعلیمات کے کسی نہ کسی کلیے یا جزیئے پر مبنی ہے۔ اسلام ہر مسلمان کے لیے واجب قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے اخلاق، عادات، آداب، معاملات، تعلقات، غرضیکہ ہر قول و فعل کو خالص اسلام کے اصولوں کے مطابق ڈھالے۔ قوانینِ شریعت مسلمانوں کے عقیدہ و ایمان سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور ان کے قلوب بھی اس قانون کی سطوت اور فرمانروائی کی زد میں ہیں۔ انسانی قوانین کا یہ عالم ہے کہ اگر ان میں سے ایک آدھ قانون کی بنیاد دین و اخلاق پر ہو بھی تو اس کے مقابلے میں سیکڑوں قوانین ایسے ہوتے ہیں جن کی بنیاد حکام اور مقننین کی خواہشات و اغراض پر ہوتی ہے۔ یہ امر باخبر حضرات سے مخفی نہیں ہے کہ یورپ کے سارے قوانین کا اصل ماخذ رومن لا ہے۔ اہلِ یورپ کے مسیحیت قبول کرنے سے بہت پہلے رومن لا وجود میں آکر اپنی ترقی کے بیشتر مدارج طے کر چکا تھا۔ علاوہ ازیں جب عیسائیت کو عروج نصیب ہوا تو وہ موسوی شریعت کو ترک کر چکی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دین کا کوئی صحیح اور نمایاں اثر قانون پر نہ پڑ سکا۔ ضابطۂ قانون کے ساتھ برائے نام چند ضمیمے شامل کر دیئے گئے جن کا حاصل صرف یہ تھا کہ دین کا نام لیا جاتا رہے اور حکومتیں اس کے نام لیواؤں کے لیے کچھ سہولتیں مہیا کرتی رہیں۔

شرعی قوانین کی خصوصیات قوانینِ شرعیہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان کا اصل مقصود اخلاقِ فاضلہ کی حمایت و حفاظت ہے۔ شریعت اس مقصد کے لیے اتنا اہتمام کرتی ہے کہ وہ اخلاقی اقدار میں سے ایک ایک قدر کو پامالی سے بچاتی ہے اور جس شے کا ادنیٰ تعلق بھی اخلاقیات سے ہو، اس کے معاملے میں شریعت کا قانون فوراً حرکت میں آجاتا ہے۔ لیکن انسانی قوانین کو اخلاقیات سے کوئی خاص شغف اور دلچسپی نہیں ہے۔ جب تک کسی شخص کی بداخلاقی کا نمایاں اور محسوس ضرر دوسرے افراد تک متعدی نہیں ہوتا، جب تک "امنِ عامہ اور نظمِ حکومت" میں کوئی خلل پڑتا نظر نہیں آتا، اس وقت تک قانون انفرادی اعمال کو خاموش تماشائی بلکہ محافظ بن کر دیکھتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر

قوانینِ مروجہ کی نگاہ میں زنا صرف اسی حالت میں جُرم اور قابلِ گرفت و دست اندازی ہے جبکہ طرفین میں سے ایک دوسرے پر جبر کرے۔ گویا کہ اصل جرم زنا نہیں بلکہ جبرو اکراہ ہے۔ جس طرح زبردستی کسی کے مال پر ہاتھ ڈالنا جرم ہے اسی طرح زبردستی اُس کی آبرو پر دست درازی بھی جرم ہے۔ لیکن باہمی رضامندی سے جس طرح ایک کا مال دوسرے کے لیے جائز ہو جاتا ہے اسی طرح گویا قانون کی نظر میں فریقین کی رضامندی سے ایک کی عصمت بھی دوسرے پر حلال ہو جاتی ہے۔ اس باہمی رضامندی کی شکل میں قانون زنا کا حامی اور محافظ بن جاتا ہے اور اگر کوئی تیسرا مداخلت کر کے اس فعل کو روکنا چاہے تو قانون اُسے دھر لیتا ہے۔ لیکن شریعت اسلامیہ کی رُو سے زنا ہر حالت اور ہر صورت میں حرام اور ناجائز ہے۔ کیونکہ شریعت کی نگاہ میں یہ ایک ایسا جرم ہے جو اخلاق کی جڑ کو کھوکھلا کر دیتا ہے اور جب اخلاق میں فساد رونما ہو جائے تو پوری جماعت میں فساد برپا ہو کر رہتا ہے اور سارے معاشرے کی بنیادیں ڈھے جاتی ہیں۔ اسی طرح قوانین موضوعہ کی نگاہ میں شراب نوشی جرم نہیں ہے اور نہ ہی اس سے پیدا شدہ بدمستی اور مدہوشی قابلِ مواخذہ ہے۔ البتہ نشے کی حالت میں اگر مخمور کسی سے گالم گلوچ یا ہاتھا پائی کر بیٹھے یا وہ شارعِ عام پر اس طرح جھومتا چلا جا رہا ہو کہ خمار اُس کی حرکات سے بالکل نمایاں ہو، تب کہیں جا کر قانون اُس پر ہاتھ ڈالے گا۔ گویا کہ قانونِ موجودہ کی رُو سے فی الحقیقت شراب خوری کا فعل قابلِ گرفت نہیں، بلکہ اصل قابلِ گرفت جُرم فقط دوسروں کو ایک خاص شکل میں ایذا پہنچانا ہے۔ شراب کے دوسرے اخلاقی، مالی اور جسمانی نقصانات جو پینے والے کو اور اُس کے گردوپیش معاشرے کو پہنچتے ہیں، قانون کو اُن کی روک تھام کی قطعاً فکر نہیں ہے۔ لیکن شریعت مجرد شراب نوشی کو حرام قرار دیتی ہے خواہ اُس سے بدمستی پیدا ہو یا نہ ہو، کیونکہ شریعت اس معاملے کو امن یا بدامنی کے ایک محدود نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ اسے نہایت وسیع اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے۔ اس کی نگاہ میں سب سے مقدم اخلاق کی حفاظت ہے۔ جب اخلاق کو بنیادی اور ہمہ گیر حیثیت اس وجہ سے حاصل ہے کہ ان قوانین کا اصل سرچشمہ دین ہے اور دین ہر حالت میں محاسنِ اخلاق کا حکم دیتا ہے اور ایک جماعتِ صالحہ کے قیام کو اپنا اولین ہدف قرار دیتا ہے۔ چونکہ دین میں تغیّر و تبدل کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے قوانینِ شریعت کا اخلاق سے رشتہ بھی

دائمی اور لاثیفک ہے۔

مروجہ قوانین کی نگاہ میں اخلاق کو کچھ زیادہ اہمیت اس وجہ سے حاصل نہیں ہے کہ ان قوانین میں اگرچہ ایک آدھ قانون ایسا بھی نکل آتا ہے جس کا رابطہ دین سے قائم ہے، لیکن بحیثیت مجموعی ان قوانین کا دعویٰ و منشا ہی یہی ہے کہ اُن کی اساس مخصوص دینی عقائد پر نہیں رکھی گئی بلکہ واقعات، رواجات اور عرف عام پر رکھی گئی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس طرح کے قوانین میں آئے دن ترمیم و اصلاح کی ضرورت پیش آتی ہے، بلکہ تغیر و تبدل اس طرح کے قوانین کی فطرت میں پیوست ہے۔ عوام، یا حکمرانوں یا سوسائٹی کے سربرآوردہ طبقوں کی عادات، ضروریات اور مصلحتیں جب بھی بدلتی ہیں، قوانین بھی ساتھ ساتھ بدل جاتے ہیں۔ اس طرح کے قوانین بنانے والے اپنے ذاتی احساسات، خواہشات اور بشری کمزوریوں سے بہر حال آزاد نہیں ہو سکتے، دوسری طرف وہ اپنے اعمال کو اخلاقی حدود و قیود کا پابند بھی نہیں کرنا چاہتے چنانچہ ان قوانین میں اخلاقی عنصر کی کارفرمائی روز بروز زائل ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ان قوانین کے علمبردار فخریہ اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے قوانین لادینی ہیں، ان کا کسی دین سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس مرحلے پر قوانین میں اصل قاعدہ و اصول اخلاقی اباحیت اور بے قیدی قرار پاتا ہے، اور اخلاقی پابندیوں کے حامل قوانین استثناء اور شاذ کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ عہدِ حاضر کے بیشتر ضابطہ ہائے قانون اپنے اس نقطۂ عروج تک پہنچ چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام، نیز وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ۔ قوانینِ شریعت کا مصدر اور مآخذ ذاتِ الٰہی ہے۔ اس کے بالمقابل قوانینِ موضوعہ کا سرچشمہ بہر حال انسان کا دماغ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شریعت کے قوانین کا احترام حاکم اور محکوم دونوں دل و جان سے کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر یقین محکم رکھتے ہیں کہ اگر اس قانون کے منشا کو پورا کیا گیا تو دنیا میں بھی سرخروئی حاصل ہوگی اور آخرت میں بھی، اور اگر اس کی خلاف ورزی کی گئی تو نہ صرف دنیا میں رسوائی ہوگی بلکہ آخرت میں بھی ایسے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا جس سے شدید تر کوئی عذاب نہیں ہو سکتا۔ قانون کی کامرانی اور قدر و قیمت کا ایک بڑا معیار یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لوگوں کے اندر اس قانون کی اطاعت

کا جذبہ کس حد تک ہے۔ اس معیار پر بھی اگر جانچا جائے تو دنیا کا کوئی قانون شرعی قانون کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انسان کے بنائے ہوئے قانون کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ نظام حکومت اور حکمران افراد کے بدل جانے سے اس طرح قانون بہت سے غیر ضروری تغیرات کا شکار ہوتا ہے اور اشخاص کی حرص و ہوا کا کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن قوانین شرعیہ اس طرح کی دست برد سے ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔ دنیا کے اکثر ممالک میں یہ طریقہ بالکل عام ہو گیا ہے کہ حزبِ مخالف جب حزبِ حکومت پر تنقید کرتی ہے تو اس کے بنائے ہوئے اور نافذ کیے ہوئے قوانین کو خاص طور پر اعتراض و ملامت کا نشانہ بناتی ہے اور مخالف پارٹی کے افراد ان کے مقابل میں نئے قوانین کا نقشہ پیش کر کے عوام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم پہلے قوانین کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر نئے اور بہتر قوانین رائج کریں گے۔ حزبِ مخالف کے ارکان ایسا رویہ اختیار کرنے میں اپنے آپ کو بالکل حق بجانب سمجھتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جن قوانین کی ہم مخالفت کر رہے ہیں اور جن کی تنسیخ کا ہم عزم رکھتے ہیں وہ بھی خطا وار انسانوں ہی کی ذہنی تراوش ہیں ... زمین کے اکثر ممالک میں قانون کی عظمت و سطوت مضمحل ہوتی چلی جا رہی ہے اور کچھ تعجب نہیں کہ مستقبل قریب میں اس کی قدر و قیمت بالکل زائل ہو کر رہ جائے۔

جن قوانین کی بنا محض مصلحت اور منفعت پر رکھی جاتی ہے انہیں فرد اور جماعت کا دائمی احترام کبھی حاصل نہیں ہو سکتا جب تک افراد یا جماعتیں یہ محسوس کرتی ہیں کہ قوانین ان کے مصالح کا ساتھ دے رہے ہیں وہ قوانین کے سامنے سر جھکاتے ہیں لیکن ان قوانین کی زد جب ان کے مفاد پر پڑنے لگتی ہے تو ان کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا جاتا ہے۔ آج کل کے بیشتر قوانینِ عالم کا یہ حال ہے کہ ان کا رشتہ دین، عقائد، اخلاق اور فضائلِ انسانی سے منقطع ہو چکا ہے۔

فسطائیت اور اس کی ستم رانیاں

پروفیسر عبد الحمید صدیقی۔ ایم اے

دنیائے انسانیت کو جب وہ امن و اطمینان، جس کے سنہرے خواب وہ تہذیب الحاد کے سائے میں دیکھ رہی تھی، نہ سرمایہ دارانہ جمہوریت سے ملا، نہ اشتراکیت کی تحریک سے، تو ایک تیسری تحریک اسی تہذیب کے بطن سے نمودار ہوئی، جسے عام طور پر فاشزم یا فسطائیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ تحریک بظاہر سرمایہ دارانہ جمہوریت اور سوشلزم کے مجموعی ردِ عمل کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، مگر گہری نظر سے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت از خود منکشف ہو جاتی ہے کہ یہ اپنے مزاج اور اساسی تصورات کے اعتبار سے بالکل اپنے پیشتر توام بھائیوں سے ملتی جلتی ہے۔ ان کی پھیلائی ہوئی بدعتیں بدلے ہوئے ناموں سے اس میں موجود ہیں۔

مغربی انسان کی یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ الحاد اس کی فطرت میں داخل ہو چکا ہے۔ جس طرح کوئی شخص اپنی فطرت سے باہر نہیں جا سکتا، اس کی حدود و قیود نہیں توڑ سکتا، اسی طرح یورپ کے زرخیز دماغ الحاد کو جو کئی سو سالوں سے اُن میں جاگزیں ہے نہیں چھوڑ سکتے۔ اُن کے دلوں میں مختلف نظاموں کے متعلق برابر شکوک و شبہات پیدا ہوتے رہتے ہیں، وہ نئی نئی تحقیقات سے ان کی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے بھی برابر جد و جہد کرتے ہیں مگر نظامِ فکر کا جو ڈھانچہ بھی وہ تعمیر کرتے ہیں اس میں الحاد ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے شامل ہو جاتا ہے۔ اُن کی حالت ققنس کی سی ہے، جو آخری عمر کو پہنچ کر اپنے گھونسلے میں آگ لگا کر جل مرتا ہے، مگر پھر راکھ میں سے وہی پہلی قسم کی زندگی پیدا کرتا ہے۔ مغربی مفکرین بھی غور و فکر، تلاش و جستجو کے بعد اپنے افکار کے آشیانوں کو اپنے ہی نغمہ ہائے آتشیں سے پھونک ڈالتے ہیں، مگر پھر ان کی خاکستر سے ویسی ہی زندگی پیدا کرتے ہیں، جس کی تلخیوں نے انہیں آشیاں سوزی پر مجبور کیا تھا۔ یہی وجہ ہے

کہ جن مفاسد سے بچنے کے لیے وہ نظامِ حیات کا ڈھانچہ بدلتے ہیں وہی برائیاں تبدیل شدہ شکل میں اُن کے سامنے جلد ہی رونما ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

سرمایہ داری، اشتراکیت، اور فسطائیت ایک ہی سلسلہ کی تین کڑیاں ہیں۔ جن برائیوں سے انسانیت کو محفوظ کرنے کے لیے یورپی مفکرین نے ایک طرف آزاد معیشت، اور دوسری طرف اشتراکی جکڑ بندیوں سے بچ نکلنے کا اہتمام کیا۔ اور اسی اہتمام کے تحت فسطائیت کی راہ اہلِ یورپ کو سجھائی، وہ ساری برائیاں خود فسطائیت میں بھی اُبھر کے رہیں۔ انسانیت کا قافلہ اس نئی شاہراہ پر ابھی چند قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اسے معلوم ہو گیا کہ وہ بربریت کے ایسے مہیب غاروں کی طرف لڑھک رہا ہے جہاں صلح، امن، اور سلامتی یکسر مفقود ہیں اور جہاں قانون، اخلاق، انصاف بالکل بے معنی الفاظ ہیں۔ اور جہاں نظم و اتحاد کی بجائے افتراق و تباہی کی فرمانروائی ہے۔ فاشزم کا یہ عظیم الشان درخت جس سرعت کے ساتھ بلند ہوا جس برق رفتاری کے ساتھ اس کی شاخیں سارے عالم میں پھیلیں وہ سطح بین آنکھوں کو متحیر کرنے کے لیے کافی ہے مگر بارآور ہونے کے بعد جب انسانیت نے اس کے پھلوں کو چکھا تو اس وقت یہ حقیقت اس پر آشکارا ہوئی کہ اس کے ثمرات صرف تلخ ہی نہیں بلکہ جان لیوا بھی ہیں۔

فاشزم کے متعلق یہ حقیقت نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ یہ ان مخصوص نظاموں کے کسی ڈھانچے کا نام نہیں جو ہٹلر نے جرمنی میں یا مسولینی نے اٹلی میں قائم کیے۔ بلکہ فسطائیت کے کچھ اساسی تصورات ہیں۔ اس کے کچھ واضح اور گنے بندھے اصول ہیں، اس کا اپنا ایک نظامِ عمل ہے۔ ان کو نظر انداز کر کے فاشزم کا کوئی ڈھانچہ تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ یورپ کی مختلف فسطائی جماعتوں کے پروگرام خواہ بظاہر ایک دوسرے سے کتنے الگ اور بعض اوقات مختلف ہی کیوں نہ ہوں، مگر غور سے دیکھنے کے بعد یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ ان کی تہ میں ایک ہی محرک، ایک ہی زاویۂ نگاہ اور ایک ہی طرزِ فکر کارفرما ہے۔ فاشزم کو خواہ جرمنی اور اٹلی میں فرمانروائی کا موقع ملے، یا اس کا علم جنوبی امریکہ، ترکی، یوگوسلاویہ، رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری، پولینڈ یا کسی دوسرے ملک میں بلند ہو۔ یہ نظام اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک ہی ہو گا اور اس سے ان ممالک میں ایک ہی طرح کے نتائج برآمد ہوں گے۔ ہٹلر اور مسولینی دونوں

نے اس بات کو صرف محسوس اور تسلیم کیا، بلکہ انہوں نے اسے پوری شد و مد کے ساتھ دنیا میں پیش بھی کیا۔ ذیل میں ہم فاشزم کے ان دو بڑے علمبرداروں کے چند اقتباسات درج کرتے ہیں تاکہ ان کے بنیادی تصورات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس سلسلہ میں مسولینی کا ارشاد یہ ہے :-

"فسطائیت فکر بھی ہے اور عمل بھی۔ یہ تحریک بعض خاص قسم کے اداروں کو تخلیق کرنے کے لیے معرض وجود میں نہیں آئی، بلکہ یہ انسان کی روحانی زندگی کی معلم بھی ہے۔ یہ اس کی داخلی اور خارجی زندگی کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کا عزم رکھتی ہے، اس کے پیش نظر انسان، اس کے اخلاق اور اعتقادات کو بدلنا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے یہ قوت کے استعمال کو بالکل جائز سمجھتی ہے۔ یہ انسان کی روح میں داخل ہو کر اس پر بلا شرکت غیرے فرمانروائی کرتی ہے۔"

اسی طرح وہ اس فکری تحریک کے عالمگیر پروگرام کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :-

"فاشزم ایک تصور، ایک عقیدہ اور ایک آفاقی تحریک ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اپنے اداروں کی ہیئت کے نقطۂ نظر سے اطالوی معلوم ہو، مگر روح کے اعتبار سے عالمگیر ہے۔ اس کے علاوہ آخر اس کا مزاج ہو بھی کیا سکتا ہے۔"

ہٹلر نے بھی قریب قریب اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"قومی اشتمالیت ایک ایسا عقیدہ ہے جو خون، رنگ، نسل اور شخصیت کی اہمیت کو ابھارتا ہے اور انتخاب طبیعی کے ابدی قوانین کی اثر آفرینی کو واضح کرتا ہے۔"

فاشزم پر کسی قسم کی تفصیلی گفتگو کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان مفکرین کی نشان دہی کریں جن کے خیالات نے اس تحریک کو جنم دیا۔ اس سلسلہ میں جو بات ذرا کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ میکیاولی، شوپن ہار، نیٹشے، رینان، نیلیتی، جارج سورل، ولیم جیمز، برگسان، ہابز اور لاک کے خیالات نے اسے جنم دیا، اور لوتھر، کانٹ، ہیگل، فشٹے، فریڈرک لسٹ کے تصورات نے اسے قومی اشتمالیت (NATIONAL SOCIALISM) کا جامہ پہنایا، اور ہٹلر اور مسولینی کی بے پناہ قوت اور بذریعہ

FASCISM & NATIONAL SOCIALISM BY MICHEL T. FLORINSKY.

اسے دنیا میں سربلندی عطا کی۔

اس تحریک کی بنیاد جن تصورات پر رکھی گئی ہے، اُن میں سب سے زیادہ اہم ریاست کی ہمہ گیری کا دعویٰ ہے۔ مسولینی اس کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"زندگی کے فسطائی تصور میں ریاست کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک فرد کے وجود کو اُسی حد تک تسلیم کرتا ہے جب تک کہ اُس کا مفاد ریاست کے مفاد سے ہم آہنگ ہو۔ ہمارے اس نظامِ فکر میں ریاست ہمہ گیر ہے۔ اس سے ہٹ کر نہ تو کسی انسانی یا روحانی تصور کو مانا جا سکتا ہے اور نہ ہی اُس کی کوئی قدر و قیمت ہے۔ جو کچھ بھی دنیا میں موجود ہے وہ ریاست میں ہے، اس سے باہر یا اس کے خلاف دنیا میں کسی دوسری چیز کا وجود نہیں"

اس طرزِ خیال کا آغاز نہ معلوم کس دور میں ہوا، مگر اسے علمی حیثیت سے ہابز نے پیش کیا۔ اُس کا گمان یہ تھا کہ مملکتی زندگی کے قیام سے پہلے جب انسان حالتِ فطری میں زندگی بسر کر رہا تھا تو اس کی یہ زندگی اس درجہ غیر محفوظ، انتشار انگیز اور وحشت افزا تھی کہ وہ اپنی بقا، اور امن و عافیت کے لیے یہ سودا کرنے پر مجبور ہو گیا کہ اپنی جان کو بچانے کے لیے وہ نہایت ہی خوش دلی سے اپنی آزادی اور اپنے اختیارات کو ایک فرمانروا کے سپرد کر دے، اور اس کی غیر مشروط اطاعت بجا لائے۔ ایک خود مختار فرمانروا کے سامنے سر بسجود ہو جانے کے بعد، اب کسی شخص کا یہ حق نہیں کہ وہ اُس پر کسی قسم کا اعتراض کرے، یا اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی کرے۔

تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ لاک (LOCKE) نے بھی یہی نظریہ پیش کیا، البتہ اس نے اس بات پر زور دیا کہ یہ معاہدہ جہاں ایک طرف افراد کے مابین طے پاتا ہے، تو دوسری طرف فرد اور فرمانروا کے روابط کو بھی متعین کرتا ہے یعنی فرمانروا اس معاہدہ کا ایک فریق ہے اور اس کی اطاعت فرمانروائی اس شرط پر مبنی ہے کہ وہ امن قائم کرے۔

روسو نے معاہدہ عمرانی کے نظریہ کو ایک اور شکل میں پیش کیا۔ وہ حالتِ فطری کو انسان کی مثالی حالت تصور کرتا ہے۔ اُس کا خیال یہ ہے کہ انسان نے اپنی زندگی کا یہ فطری انداز ترک کر کے مملکتی زندگی

کا قلادہ اس وجہ سے نہیں پہنا کہ وہ امن و عافیت سے محروم تھا۔ بلکہ آزادی کے بدلے غلامی کو اختیار کرنے کا اصل سبب یہ تھا کہ ابن آدم اپنی فطری کمزوریوں کے باعث اس پُر مسرت اور پُر امن زندگی کو دیر تک قائم نہ رکھ سکا اور مملکت کے قیام پر مجبور ہوا۔ روسو کے نزدیک معاہدہ عمرانی افراد کے مابین طے پاتا ہے جس کے ذریعہ سب افراد اپنی آزادیوں کو ارادہ عامہ (GENERAL WILL) کے تابع کر دیتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق فرمانروا خواہ وہ ایک فرد ہو یا کوئی ادارہ، وہ اسی ارادۂ عامہ کا مظہر ہوتا ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ یہ ارادۂ عامہ اکثریت کی رائے یا تمام افراد کی رائے سے بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ اس میں کچھ آسمانی خصوصیات شامل ہو کر اسے بالکل منزہ عن الخطا بنا دیتی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس "ارادۂ عامہ" کو سمجھنے کا کسے استحقاق ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ایک فرمانروا ہی اس کی اہلیت رکھتا ہے، وہی اس قابل ہے کہ اپنی ذہانت و طباعی سے "ارادۂ عامہ" کے "خاموش اشاروں" کو جان کر عوام کو نہ صرف ان سے مطلع کرے بلکہ انہیں قوت کے ساتھ ان کا پابند بھی بنائے کیونکہ کسی فرد یا سوسائٹی کا جو فکر و عمل بھی اس سے ہٹ کر ہوگا وہ یقیناً گمراہی کی طرف لے جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں آپ اس نظریہ کو یوں سمجھیے کہ ایک فرمانروا ہی صحیح بات کہنے کا مجاز ہے، افراد کا فرض صرف اسی قدر ہے کہ وہ بالکل آنکھیں بند کرکے اس کے احکام کو مانتے چلے جائیں۔ وہ انسانوں کے اس بے زبان گلہ کو جسے سماج یا سوسائٹی کہا جاتا ہے، میکانکی طور پر اپنے قوت و اقتدار سے جدھر چاہے ہانکتا پھرے۔ دنیا کی کسی قوت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کے "الہامی پروگرام" میں دخیل ہو۔

پھر فرمانروا کے اس سارے غیر معقول طرزِ عمل کو جو سراسر باطل افکار پر مبنی ہے، ریاست کے مفاد عمومی کے نام پر جائز اور برحق قرار دیا جاتا ہے۔ انسان کے ذہن میں سب سے پہلے اس غلط تصور کو بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ "فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں" اس لیے ہر وہ چیز جو ربطِ ملت میں حائل ہو وہ سراسر باطل ہے۔ لہٰذا ریاست کے سارے بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ ہر قیمت

پر اس کا استیصال کریں۔ ایک انسان کی حیثیت سماج کے نامیہ میں ایک خلیہ (CELL) کی سی ہے۔ ریاست کی غیر مشروط خدمت اور چاکری میں ہی اس کی آزادی ہے۔ جو شخص اپنے رجحانات کو ریاست کے طرزِ عمل کے مطابق نہیں ڈھالتا وہ ملک و ملت کا دشمن ہے اور اُسے جتنی جلدی دنیا سے ختم کر دیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ ایک فرد کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی ہونا چاہیے کہ وہ مملکت کی خاطر اپنے آپ کو بالکل مٹا ڈالے، اپنی تمام خواہشوں، آرزوؤں اور عزائم کو اس کی مشیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دے۔ اس کا جینا اور مرنا اسی کی خاطر ہو، اُس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی کے لیے وقف ہو وہ اگر مانگے تو اسی سے مانگے، اور جھکے تو اسی کے آگے جھکے۔

اس تصور کی رو سے مملکت کسی دوسرے مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں، بلکہ مقصود بالذات ہے۔ یہ محض اعتباری اور مجازی طور پر مقتدر نہیں، بلکہ اس میں الوہیت کی صفات بھی موجود ہیں۔ لہٰذا انسان کی نہ صرف مادی فلاح اس کی اطاعت کیشی پر منحصر ہے، بلکہ اُس کی روحانی سربلندی بھی اُس کی پرستش سے وابستہ ہے۔

مملکت کو ازلی اور ابدی اور واجب بالذات قرار دینے کا لازمی نتیجہ ہے کہ اُسے نہ صرف ہر قسم کی قیود سے آزاد سمجھا جائے بلکہ یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ تمام قسم کی اخلاقی اور معاشرتی پابندیاں عائد کرنے کا غیر محدود حق اسے ــــ اور تنہا اسے ــــ حاصل ہے۔ تمام اصول اور قوانین کا واحد سرچشمہ صرف وہی ہے۔ وہ جن جن طریقوں سے بھی اپنے بقا و استحکام کے لیے کوشش کرے وہ جائز اور مبنی بر انصاف ہیں۔ ان پر کسی قسم کی حرف گیری نہ ہونی چاہیے بلکہ عوام کو انہیں ہی راستی اور عدل کا اصل معیار سمجھنا چاہیے۔ اس لحاظ سے مذہب و اخلاق سے اگر یہ مقاصد حاصل ہوں تو انہیں اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر یہ اس راستے میں مزاحم ہوں، تو انہیں یکسر چھوڑ دینا چاہیے۔

ہیگل نے اپنی کتاب فلسفۂ تاریخ میں ان افکار کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> "ریاست اس سرزمین پر ایک الہامی تصور ہے، ایک فرد میں جو صلاحیت بھی پائی جاتی ہے اُس کی جو قدر و قیمت بھی ہے وہ صرف اسی کی وجہ سے ہے۔ ریاست مقصود بالذات ہے۔

اسی کا حق سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ ایک فرد کا سب سے اولین اور بڑا فرض ریاست کی رکنیت اختیار کرنا ہے۔"

مسولینی نے اسی نظریہ کی تائید میں کہا ہے :-

"فاشزم ریاست کو افراد اور گروہوں کے مقابلہ میں بالکل مطلق العنان تصور کرتا ہے۔ فسطائی ریاست ارادہ اور اختیار رکھنے والی ایک باشعور شخصیت ہے۔ اسے ایک اخلاقی ریاست سمجھنا چاہیے جو اپنے اندر اخلاقی اور روحانی پہلو بھی رکھتی ہے۔

قومی ریاست کا یہ نظریاتی ارتقاء جہاں چند اصحابِ فکر کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے وہاں یہ چند تاریخی واقعات کا رہینِ منت بھی ہے۔ فرانسیسی انقلاب کے بعد جب نپولین کی شہنشاہیت قائم ہوئی اور فرانسیسی فوجیں یورپ کی سرزمین پر سیلاب کی موجوں کی طرح پھیل گئیں تو اس "سیلِ بے پناہ" کو روکنے کے لیے مختلف اقوام کے اندر ایک جذبہ بیدار ہوا جس سے سیاسی دنیا اس وقت تک ناآشنا تھی۔ یہ قومیت کا جذبہ تھا۔ جب غیرت وحمیت نے اس پر تازیانہ کا کام کیا تو اس نے سیاسی نظریات وافکار میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔ ریاست اب تک ایک تصور تھی جسے اصولاً چاہے جتنی اہمیت دی جاتی ہو مگر عملاً لوگ اس کی ہستی کو فرضی سمجھتے تھے، اور وہ اصل چیز حکومت کو تصور کرتے تھے، کیونکہ یہ اُن کے سامنے پیکرِ محسوس کی شکل میں جلوہ گر تھی، وہ اُن کی زندگیوں پر نہایت گہرے طور پر اثر انداز تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ریاست کے بارے میں بھی وہی رائے قائم کر لیتے جو حکومت کے بارے میں رکھتے تھے، مگر ینا (JENA) کے میدان میں پرشیا کی شکست اور اس کے بعد نپولین کے جرمنی پر بالکل حاوی ہو جانے کا سیاست اور سیاسی ذہنیت پر وہ اثر پڑا جو یورپ کے تمام فلاسفہ کی قیل وقال اور انقلاب کی ساری کشمکش کو نصیب نہ ہوا تھا۔ قومیت کے جذبے نے صرف جرمنی کو نپولین کے ظلم سے آزاد نہیں کیا بلکہ معاشرے میں ربط اور سیاسی فلسفے میں معنی پیدا کرنے کا ایک بہت اچھا ذریعہ فراہم کر دیا۔ لہٰذا جرمنی کو اتحاد اور ایثار پر آمادہ اسی عقیدے نے کیا کہ وہ ایک قوم ہیں، ان کی ایک خاص تہذیب ہے، اس تہذیب کی حفاظت کرنا اور قوم کی عزت قائم رکھنا اُن کا سب سے بڑا

فرض ہے اور یہ فرض صرف ریاست سرانجام دے سکتی ہے۔ اسی طرح قومیت کے احساس اور تہذیب کے قدر دانوں نے جرمنی قوم کو ریاست کے استحکام اور اس کی قوت اور اقتدار کو حتی الامکان بڑھانے کی مصلحت سمجھائی۔ رفتہ رفتہ جرمنوں کی ایک خاصی بڑی جماعت کو پروشیا کی سلطنت سے وہ گہرا روحانی، اخلاقی اور تہذیبی تعلق ہو گیا جو فلسفے کی رو سے ایک سچے شہری کو اپنی ریاست سے ہونا چاہیے، اور ریاست کے عینی تصور نے، جو زیادہ سے زیادہ ایک فلسفیانہ حقیقت تھا، ایک واقعی ریاست کی شکل اختیار کر لی۔[1]

یہی وہ دور تھا جس میں انسان نے بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اس سے بڑی بڑی مشینیں چلوانی شروع کیں۔ اس سے پیداوار میں حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ مگر یہ "ترقی" سراپا رحمت نہ تھی بلکہ اس نے مختلف قوموں اور ملکوں کے سامنے بے شمار پیچیدہ مسائل کھڑے کر دیئے۔ وہ قومیں جو اس صنعتی انقلاب کی دوڑ میں آگے تھیں وہ کچھ مدت کے لیے تو دنیا کی دولت بے خطر سمیٹتی رہیں، مگر جلد ہی ان کے حریف پیدا ہو گئے اور اس میدان میں مسابقت کا دور شروع ہوا۔ ظاہر بات ہے کہ شکار گاہوں کی تلاش کچھ آسان کام نہ تھا، اس کے لیے بڑے بڑے معرکے ہوئے تب کہیں جا کر طاقتور شکاریوں کو اطمینان اور چین سے شکار کرنے کا موقع ملا۔

یہ مہمات اسی صورت میں سر کی جا سکتی تھیں جب ملک کے اندر اتحاد اور یک جہتی ہو، جب ایک ہی جذبہ ساری قوم کو متحرک کر دے، اور ملک کے سارے باشندے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بلا چون و چرا ان بڑے بڑے اور کہنہ مشق "شکاریوں" کے حوالے کر دیں۔ اسی جذبے نے ملک میں فسطائی رجحانات کو تقویت دی، اور پوری کی پوری قوم میں بلا سوچے سمجھے ایک فرد یا گروہ کی پیروی میں دوسروں پر ٹوٹ پڑیں۔

دوسری طرف جب کمزور اقوام نے یہ دیکھا کہ ان کی زندگی پر آبنی ہے تو انہوں نے بھی اپنے آپ کو بچانے کے لیے اپنے گرد قومیت کی دیواریں کھڑی کر دیں، اور ان کے پیچھے پناہ ڈھونڈی۔ بیرونی خطرات نے ان سب کو

---

[1] تاریخ فلسفۂ سیاسیات از محمد مجیب

ایک مرکز پر جمع کر دیا اور وہ متحد ہو کر دشمن کے خلاف صف آرا ہوئیں۔

انسانی ذہن کبھی خلا میں کام نہیں کرتا۔ اس کے لیے کوئی نہ کوئی اساس ضرور ہونی چاہیے۔ اُسے اگر ایجابی محرکات مہیا نہ ہوں تو وہ سلبی جذبوں سے کام لیتا ہے۔ اس کا واضح ثبوت ہمیں قومی ریاست میں ملتا ہے۔ کلیسا اور مذہب کی شکست کے بعد مغربی ذہن نے کچھ اس قسم کے محرکات کو جنم دینے کا عزم کیا جن سے اُس کی زندگی کا عمل جاری رہ سکے۔ اسی کے نتیجہ میں حق پرستی کو چھوڑ کر قومیت پرستی کو ایک دین کی حیثیت سے اختیار کیا گیا۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قومیت ایک قسم کا نفسیاتی احساس ہے جسے نہایت ہی غلط اور بھونڈے طریقے سے روحانی احساس کی جگہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر جس طرح دین انسان کے اس روحانی جذبہ کو ایک محسوس شکل میں منتشکل کرتا ہے، اسی طرح ریاست پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ احساس قومی کو عملی جامہ پہنائے۔ اس نقطۂ نظر سے مملکت اب ایک ایسی تنظیم بن گئی ہے جو ایک طرف تو قوم کے ارادہ اور منشا کا مظہر ہوتی ہے اور دوسری طرف اُس کی اجتماعی زندگی کی سب سے بڑی محرک۔ مملکتی نظم و نسق کی وحدت اور معاشی مفاد کی یکسانیت سے قومیت کے جذبہ کو نشو و نما پانے کا پورا موقع ملتا ہے جسے دوسری اقوام سے معاشی مقابلہ کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح یہ جذبہ ایجابی اور سلبی طور پر موجودہ دور کے قوم پرست انسان کو سرگرم عمل کر رہا ہے۔ اس کی حیثیت آج وہی ہے جو آج سے چند سو سال پہلے دین و اخلاق کی تھی، آج انسان اس نئے بت کے سامنے اسی طرح سربسجود ہیں جس طرح کہ کبھی وہ ایک بلند و بالاتر ہستی کے سامنے جھکتے تھے ؎

فکرِ انساں بت پرستے، بت گرے

ہر زماں در جستجوئے پیکرے

باز طرحِ آذری انداخت است

تازہ تر پروردگارے ساخت است

کاید از خوں ریختن اندر طرب

نام او رنگ است وہم ملک و نسب

پاکستان اور اسلامی حکومت

(جناب مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی)

[ہندوستان کے مشہور دینی ماہنامہ "الفرقان" (لکھنؤ) کا یہ اداریہ پاکستان کے موجودہ بحرانی دور کے متعلق بڑے درد و سوز کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس کی سطر سطر سے اُس عظیم اسلامی نصب العین کے لیے تڑپ نمایاں ہے جو کرۂ ارضی کے تمام مسلمانوں کا اصل سرمایۂ حیات ہے۔ یہ تڑپ جب تک باقی ہے، ہمارے مشترک اسلامی احساسات کو دریاؤں اور پہاڑوں کی جغرافی لکیریں کبھی باہم دگر منقطع نہیں کر سکتیں۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ہماری نوخیز مملکت کے دورِ تعمیر و تشکیل پر دنیا بھر کے مسلمانوں کی توجہات لگا دی ہیں۔ اس اداریے کے مطالعے سے اندازہ کیجیے کہ ہمارے بناؤ اور ہمارے بگاڑ سے ہمارے سرحد پار کے اسلامی ذہنوں کو کتنی گہری دلچسپی ہے۔ پھر یہ سطور اس قابل ہیں کہ ان سے ہمارے ملک کے عوام بھی اور فعال عناصر بھی درسِ عبرت لیں۔ یہ اداریہ اگرچہ الفرقان کے دسمبر کے شمارے میں شائع ہوا تھا، لیکن ابھی تک یہ پرانا نہیں ہوا ہے۔ اس لیے ہم اسے اپنے صفحات میں پیش کر رہے ہیں۔]

اس وقت کے پاکستان کو دیکھ کر ۴۵-۴۶ء کا زمانہ یاد آتا ہے جبکہ پاکستان کے حصول کی جدوجہد ہو رہی تھی۔ مسلمانانِ ہند پاکستان کی شکل میں ایک اسلامی حکومت کا خواب دیکھ رہے تھے۔ مسلم لیگ کے قائدین انہیں ملک کے اِس سرے سے اُس سرے تک بتلاتے پھر رہے تھے کہ پاکستان کے معنی کیا؟ "لا الٰہ الا اللہ"۔ اور مسلمان تھے کہ ایمان بالغیب کی طرح مان رہے تھے کہ "پاکستان واقعۃً لا الٰہ الا اللہ کی عملی تفسیر ہوگا، وہاں قرآن کی حکومت ہوگی، وہاں اسلام کا سکہ چلے گا، وہاں مسلمانوں کا نظامِ زندگی ان کے مذہب کی روشنی میں تیار ہوگا اور ان کا تہذیب و تمدن غیر اسلامی عناصر سے پاک ہو کر خالص

اسلام کی نمائندگی کرے گا ـــــ لہٰذا پاکستان کی مخالفت لا الٰہ الا اللہ کی مخالفت ہے، اسلام کی مخالفت ہے۔ اسلامی تہذیب وتمدن کی مخالفت ہے اور ملت کے حق میں ناقابلِ معافی جرم ہے ـــــ جو لوگ پاکستان کے مخالف تھے اور اس کے مقابلہ میں جو سیاسی نظریہ پیش کرتے تھے وہ صحیح تھا یا غلط؟ اس بحث کو جانے دیجیے کیونکہ اس کا وقت گزر چکا ہے۔ لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ وہ ان دلفریب نعروں کے متعلق جب یہ کہتے تھے کہ یہ محض فریب ہے، سیاسی چال ہے تو کیا وہ غلط کہتے تھے؟ ان کی بات کتنی سیدھی اور صاف تھی کہ جن لوگوں کی زندگی نہ پہلے اسلامی تھی اور نہ ان نعروں کے لگاتے وقت اسلامی ہے بلکہ جو دینی زندگی کو اختیار کرتے ہوئے شرماتے ہیں اور اس پر ملائیت کی پھبتیاں کسا کرتے ہیں، ان سے آخر کیسے توقع کر لی جائے کہ وہ ایک اسلامی حکومت کی تعمیر کریں گے۔ حالانکہ اسلامی حکومت اگر واقعی اسلامی حکومت ہو تو اس کی نظرِ احتساب پر سب سے پہلے یہی لوگ چڑھیں گے۔ مگر مسلمان اس وقت نشہ میں تھے۔ وہ اپنے یقین میں کسی تشکیک کی دخل اندازی کے روادار نہ تھے اور "گندم از گندم بروید جو ز جو" جیسی ابدی سچائی پر کان دھرنے کے لیے تیار نہ تھے ـــــ مگر کیا کسی کے آنکھیں بند کرنے سے یہ حقیقت باطل ہو سکتی ہے اور جو بو کر گندم کاٹنے کی امید کرنے والے کی امید کبھی پوری ہو سکتی ہے، ایسی امیدوں کا نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کبھی کچھ اور نکلا ہے یا کچھ اور نکل سکتا ہے؟ مسلم لیگ کی مغرب زدہ قیادت سے اسلامی حکومت کے قیام کی امیدیں وابستہ کرنے کا نتیجہ آج سامنے ہے۔ جوں جوں وقت گذرتا جا رہا ہے اس سرزمینِ پاک پر اسلام مقہور سے مقہور تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور اب اس کو ملّا ازم کا نام دے کر کمیونزم کے ساتھ باندھ کر فنا کے گھاٹ اتارنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ صاف صاف کہا جا رہا ہے کہ "تیرہ سو برس کے عرصہ میں کہیں اسلامی حکومت قائم ہوئی بھی ہے۔ جو آج پاکستان میں قائم ہو گی!" اور دیدہ دلیری کی حد ہے کہ یہ بات خاص یو۔پی کی راجدھانی میں کہی گئی ہے جہاں آج بھی اگر کوئی کان لگائے تو فضاؤں میں "پاکستان کے معنی کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کے نعرے گونجتے ہوئے ملیں گے۔

جب تک پاکستان بنا نہیں تھا پاکستان کے معنی لا الٰہ الا اللہ کے تھے۔ اس کی مخالفت قرآن

کی مخالفت تھی، قرآنی نظام کی مخالفت تھی، حکومتِ الٰہیہ کی مخالفت تھی، مگر جب پاکستان بن گیا تو قرآنی نظامِ حکومت کی مخالفت ہی میں اس کے استحکام کی ضمانت پوشیدہ ہوگئی اور قرآنی نظامِ حکومت کا مطالبہ تخریبی عمل قرار پاگیا ؎

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اُس وقت جن علماء نے پاکستان کے قیام کی مخالفت کی انہیں دشمنِ اسلام اور غدارِ ملت کہہ کر ان کی پگڑیاں اچھلوائی گئیں اور آج جو علماء اور مخلص مسلمان کل کے وعدوں کے مطابق اسلامی حکومت کے قیام کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ پاکستان کے دشمن اور شورش پسند قرار دیئے جا رہے ہیں اور نادر شاہانہ انداز میں فرمایا جا رہا ہے کہ "یہ سب ہندوستان ہی سے گئے ہوئے لوگ ہیں، ان سب کو چاندی کی کشتی میں لگا کر ہندوستان ہی واپس کر دیا جائیگا" ---- یہ ہے اُس خواب کی تعبیر جو سات سال پہلے ہندوستان کے مسلمانوں نے دیکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کو ٹھنڈا رکھے، اچھا ہوا وہ پہلے ہی تشریف لے گئے ورنہ انہیں دیکھنا پڑتا کہ ان کی امیدوں اور آرزوؤں کا انجام کتنا حسرتناک ہے۔

ہمیں ان باتوں پر ذرا بھی حیرت نہیں ہے جو پاکستان کے وزیرِ داخلہ نے لکھنؤ کے ہوائی اڈہ پر ایک مولوی صورت اخباری نمائندے سے کہیں اور نہ ہمیں ان فقروں پر ذرہ برابر حیرت ہے جو انہوں نے (پوری جرأتِ رندانہ کے ساتھ) اس مولویانہ صورت پر چُسپت کیے۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ سات سال پہلے کی باتیں بے ساختہ یاد آگئیں اور اپنی قوم کی بے شعوری پر بے اختیار ماتم کرنے کو جی چاہنے لگا جو اتنا نہیں جانتی کہ کن لوگوں سے کن باتوں کی امید رکھنی چاہیے۔ کاش یہی تجربہ آئندہ کے لیے اس کی آنکھیں کھول دیتا۔

قیامِ پاکستان کی جدوجہد کے زمانہ میں تحریکِ پاکستان کے لیڈر اپنے مخالف علماء کو طرح طرح کے القاب سے نواز کر جب گندے انڈوں اور ٹماٹروں والی تہذیب کا مظاہرہ کیا کرتے تھے تو لوگ سمجھتے تھے کہ یہ علماء چونکہ ملت فروشی کر رہے ہیں اس لیے ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا جا رہا ہے اور یہ اپنے جرم کی بنا پر اسی کے مستحق ہیں لیکن حقیقت یہ تھی جو آج بے نقاب ہو کر سامنے آگئی ہے کہ اس الزام کی آڑ میں دراصل علماء کے وقار کو ختم کرنا مقصود تھا۔ اس لیے کہ انہی کے ذریعہ سے مسلمانوں میں دین کا وقار و احترام اور پاس و لحاظ قائم تھا اور یہی اس کے پاسباں و نگہبان تھے اور دین کے وقار و احترام اور پاس و لحاظ کی موجودگی میں ان

لوگوں کی دال مسلمانوں میں اچھی طرح نہیں گل سکتی تھی، یہ من مانی قیادت نہیں کر سکتے تھے اور قوم ان کی اغراض وخواہشات کا کھلونا نہیں بن سکتی تھی۔ چنانچہ دیکھ لیجیے کہ وہ علماء جنہوں نے تحریک پاکستان کی حمایت کی، اس کو دینی سند بہم پہنچائی اور قائدین لیگ کے کندھے سے کندھا ملا کر چلے یا کم از کم مخالفت نہیں کی وہ آج سربراہ کاران مملکت پاکستان کے اسی طرح معتوب بنے ہوئے ہیں جیسے کہ مخالف علماء تھے۔ ان کا وجود تک برداشت نہیں ہے اور ارادہ ہے (اگر خدا نے پورا ہونے دیا) کہ ان سب کو ملک بدر کر دیا جائے — ان کا کیا جرم ہے؟ انہوں نے بھی قوم کے مفاد سے "غداری" کی تھی، مسلمانوں کو ہندوؤں کے ہاتھ بیچنے کی ٹھانی تھی، اسلامی حکومت (پاکستان) کے قیام میں روڑے اٹکائے تھے؟ آخر ان کا جرم کیا ہے؟

ان کا جرم صرف یہ ہے کہ یہ ان وعدوں کا ایفا چاہتے ہیں جو پاکستان بننے سے پیشتر کیے گئے تھے، یہ اُس خواب کی تعبیر چاہتے ہیں جو سات برس پہلے دکھایا گیا تھا۔ وہ پاکستان کا دستور قرآن و حدیث کے مطابق بنوانا چاہتے ہیں، وہ حکومت کو اقامتہ صلوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ادارہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ یہی اسلامی حکومت کی علتِ غائی ہے اور انہی چیزوں کو قرآن نے مسلمانوں کی حکومت کا نشان تبلایا ہے۔

وَاِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔

اور اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار بخشیں تو یہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، نیکیوں کا حکم کریں اور برائیوں سے روکیں۔

اور ایسا ہونے میں پاکستان کی موجودہ قیادت کو اپنی موت نظر آتی ہے۔ اپنی پسندیدہ تہذیب و تمدن کا گلا گھٹتا نظر آتا ہے اور ان منکرات کے لیے خطرہ نظر آتا ہے جن کے وہ دلدادہ ہیں اور جو ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ ملک کا دستور قرآن و حدیث کے مطابق ہونے کے بعد کاک ٹیل پارٹیاں جاری نہیں رہ سکتیں، شراب کی بدمستیاں جاری نہیں رہ سکتیں۔ طاؤس و رباب اور جام و سبو کے مشغلے جاری نہیں رہ سکتے، عیش و طرب کی رنگ رلیاں باقی نہیں رہ سکتیں، مینا بازاروں کی جلوہ ریزیاں اور عشوہ طرازیاں باقی نہیں رہ سکتیں، سینماؤں کی عریانیاں باقی نہیں رہ سکتیں، حوا کی جوان بیٹیوں کو سڑکوں، کلبوں اور ہوٹلوں

میں لاکر ذریعۂ تفریح نہیں بنایا جاسکتا اور ان سے مارچ پاسٹ کرا کے سلامیاں نہیں لی جاسکتیں ۔ مختصر یہ کہ پاکستان کو لندن، پیرس اور نیویارک نہیں بنایا جاسکتا، جو ان کا منتہائے آرزو ہے اور جس کے بغیر ان کے نزدیک زندگی میں کوئی مزہ نہیں۔

ضروری نہیں کہ پاکستان کا ہر امیر و وزیر ان چیزوں کا دلدادہ ہو مگر اس میں شبہ نہیں کہ اصل زمامِ کار جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے ان کا مذاق و مزاج اسی قسم کا ہے۔ پھر یہ گنتی کے چند افراد ہی نہیں ہیں جو اپنے تحفظات کے لیے اہلِ دین کو دبانا چاہتے ہیں بلکہ ایک پورے کا پورا طبقہ ہے جس کا ان سے گٹھ جوڑ ہے، کیونکہ اُس کا اور ان کا مفاد بالکل ایک ہے، یہ دراصل اسی طبقہ کے نمائندے ہیں اور نمائندگی کا پورا حق ادا کر رہے ہیں اور اس کے اور اپنے مشترک مفاد کے لیے ہر ناکردنی کے لیے تیار ہیں۔

اور پھر یہ طبقہ صرف اسی سمت سے کوشش پر قانع نہیں ہے بلکہ اپنے بچاؤ کے لیے جتنے بھی جتن وہ کرسکتا ہے سب کر رہا ہے، ایک پورا گروہ کا گروہ اُس نے اہلِ قرآن کے نام سے کھڑا کر دیا ہے جو حدیث و فقہ کے ذخائر پر پوری قوت سے گھن بجا رہا ہے، کیونکہ ان ذخائر سے قرآن کی جو تشریحات اور اسلام کی جو تفصیلات، اس کا عملی و اعتقادی نقشہ اور اس کے حدود و قیود نکلتے ہیں اُن سے علماء کے پیش کردہ مذہبی نقشہ کی تائید و تصدیق ہوتی ہے اور یہ نقشہ اس طبقہ کی خواہشات کے بالکل خلاف ہے۔ اس لیے کہ اس نقشہ میں اس کی ان دلچسپیوں کی بالکل گنجائش نہیں نکلتی۔ اور تیسری سمت سے کوشش یہ طبقہ اربابِ حکومت کے تعاون سے خود کر رہا ہے، یہ کوشش ہے اپنے مذاق اور اپنی دلچسپیوں کو متعدی کرنے کی، تاکہ وہ اپنی قلتِ تعداد کی وجہ سے نکو نہ بن سکے۔ اس دُم کٹی لومڑی کی طرح جو انگشت نمائی سے بچنے کے لیے اپنی تمام ہم جنسوں کو دُم بریدگی کے فوائد سمجھاتی پھرتی تھی، یا اُس کوزہ پُشت انسان کی طرح جو خود کو طعنہ زنی سے بچانے کے لیے تمام انسانوں کے کوزہ پشت ہونے کے لیے دست بدعا تھا۔

پس ایک طرف تبرج جاہلیۃ کی تبلیغ کی جارہی ہے۔ منکرات کو مرغوب بنانے کے لیے فلسفے گھڑے جارہے ہیں، منطقیں چھانٹی جارہی ہیں اور ان اوصاف کی بے محابا نمائشیں کرکے نو واردوں کی جھجک دور کی جارہی ہے اور اس مقصد کے لیے سوسائٹیاں قائم کی جارہی ہیں، دوسری طرف ایک نیا اسلام ترتیب دیا

جارہا ہے جس میں رسول کی کوئی حیثیت نہیں، اس کے ارشادات کی کوئی وقعت نہیں۔ اس کے اسوۂ حسنہ کی کوئی اہمیت نہیں اور اس کی اطاعت کا کوئی سوال نہیں اور جب رسول ہی کچھ نہیں تو صحابہ کرام اور ائمہ دین کا تو سوال ہی کیا! اسلام کے اس جدید ماڈل میں نماز وہ نماز نہیں جس کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک کے مسلمان پڑھتے آئے ہیں اور وہ نماز نہیں جس کی صفت قرآن نے تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ بتلائی ہے، بلکہ عیسائیوں کی PRAYER جیسی ہے۔ جس میں نہی عن الفحشاء والمنکر کی کوئی طاقت نہیں اور جس کا گرجا سے باہر کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اسلام عبادات پر کوئی زور نہیں دیتا کیونکہ جس طبقہ کے ایما پر اس کی ترتیب و تالیف کا کام کیا جا رہا ہے اُسے نہ صرف یہ کہ عبادات سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ انہیں ایک وبال اور جنجال سمجھتا ہے، اور اس کی زندگی کے نقشہ میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں اس نئے اسلام کو صرف اس منفی پہلو سے دلچسپی ہے کہ عبادات کا رائج نظام اور اس کے قواعد و ضوابط اللہ کے نہیں بلکہ "ملا" کے مدون کردہ ہیں۔ لہٰذا ان کو دین سے خارج کرنا چاہیے اسی طرح یہ اسلام دین کے اخلاقی حدود و قیود اور تمدنی و معاشرتی ضوابط و احکام کو کوئی اہمیت نہیں دیتا بلکہ ممکن حد تک ان کو اس طبقہ کی خواہشات سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ غرض دینی اصطلاحات اور اقدار کے وحی سے متعین شدہ مطالب و مفہومات کو "ملا" کی گڑھنت قرار دے کر ان اصطلاحات و اقدار کو خود تراشیدہ و خود پسندیدہ معنی پہنانے کے لیے اہلِ قرآن کا یہ "برعکس نہند نام زنگی کافور" کا مصداق، گروہ پوری طرح سرگرم عمل ہے ـــــ صلوٰۃ کا ایک نیا مطلب تیار ہے۔ زکوٰۃ کی ایک نئی تشریح حاضر ہے۔ معروف و منکر کا ایک ایسا مفہوم دریافت ہو چکا ہے جس نے معنوی تحریفات کا اب تک کا سارا ریکارڈ توڑ دیا ہے اور اس سب سے بڑھ کر دین کی اصل اساس آخرت کا ایک ایسا تصور پیش کر دیا گیا ہے کہ تنہا وہ ہی اگر مقبول ہو جائے تو بلا کسی مزید کوشش کے دین کی ساری عمارت آپ سے آپ منہدم ہو جائے گی اور "ملا" اور "دینِ ملا" کا خرخشہ ہی ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔

یہ دونوں کوششیں پوری سرگرمی کے ساتھ حکومت وقت کی سرپرستی میں جاری ہیں اور تیسرا محاذ خود حکومت نے قائم رکھا ہے۔ جہاں سے مختلف طریقوں سے اہلِ دین کی کوششوں کو پسپا کرنے کی جدوجہد

جاری ہے۔ سب سے پہلے نفاق کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ کیونکہ یہ طریقہ ہمیشہ بہت کامیاب اور بے خطر رہا ہے۔ جب پبلک میں آتے، زبان پر اسلام اور قرآن جاری ہو جاتا۔ اسلام کے تعلق پر فخر کیا جاتا۔ قرآن جیسی ہدایت کے امین ہونے پر ناز کیا جاتا اور ذومعنیین الفاظ میں لوگوں کو یقین دلانے کی کوشش کی جاتی کہ پچھلے وعدوں کو پس پشت نہیں ڈالا گیا ہے مگر منافقت کی ٹٹی خالی زبان کے بل پر قائم نہیں رہ سکتی اس کے لیے کچھ روپ بھرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے، مگر یہ تقلید اور تکلف ان سے نہ ہو سکا۔ قول و عمل کا تضاد نمایاں سے نمایاں تر ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آنے لگی کہ کعبہ کا نام لے کر قافلہ کو نہایت تیزی کے ساتھ ترکستان کی طرف بڑھایا جا رہا ہے، بعض لوگوں نے اندرونی طور پر قائل و معقول کرنے کی کوشش کی اور بعض لوگوں نے باہر سے احتجاج شروع کیا، جس کے بعد قافلہ کا رُخ کچھ پھرتا نظر آیا۔ اس تبدیلی سے مغرب زدہ طبقہ کو (وہی طبقہ جس کا ذکر ہم نے سطور بالا میں کیا ہے) اپنا مفاد اور اپنا مستقبل خطرہ سے دوچار ہوتا نظر آیا۔ وہ بے چین تھا کہ اس تبدیلی کو کیسے روکے کہ یکایک اُسے ایک بہترین موقع مل گیا: قادیانیت کے خلاف ایجی ٹیشن شروع ہو گیا اور بدقسمتی سے بعض جوشیلوں اور جلد بازوں کی بدولت اور عوام کی دینی تربیت نہ ہونے کے باعث بلکہ اُس تربیت کے باعث جو انہیں تحریک پاکستان کے سلسلہ میں دی گئی تھی، اس سلسلہ میں کچھ ایسی غلط باتوں کا ارتکاب ہو گیا جن سے اس طبقہ کے اُن نمائندوں کو جو حکومت میں دخیل تھے، اہل دین کو بدنام کرنے اور کچلنے کا ایک بہانہ مل گیا اور اس موقع سے انہوں نے جی بھر کر فائدہ اُٹھایا، پہلے تو طاقت کے استعمال سے عوام کو سراسیمہ کیا گیا، اور پھر علماء کے خلاف پروپیگنڈے کی ایک مہم چلائی گئی، جس کے خاص خاص نعرے یہ تھے "ملا سے ہشیار رہو"، "ملا اقتدار کا بھوکا ہے"، "ملا کی حکومت سے اللہ کی پناہ"۔ "اسلامی حکومتوں کو ہمیشہ ملا ہی نے تباہ و برباد کیا ہے۔" ان نعروں کے کتبات آویزاں کیے گئے۔ انہیں زبانوں پر چڑھا کر ملک کی فضا کو علماء کے خلاف نفرت سے بھر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک تحقیقاتی عدالت[1] بٹھائی گئی۔ . .

. . . .

. . . .

[1] اس موقع پر تحقیقاتی عدالت کے متعلق جو سطور درج تھیں، وہ ہم نے حذف کر دی ہیں۔

تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ کے بعد فضا اس بات کے لیے ہموار ہو چکی تھی کہ علماء کو مذہبی مجنون، فسادی اور ملک دشمن قرار دے کر سیاسیات میں دخل دینے کی ممانعت کر دی جائے، اور صاف صاف اعلان کر دیا جائے کہ اس ملک میں اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکتی، چنانچہ اس مغرب زدہ طبقہ کا ایک نمائندہ جب سیکرٹریٹ سے اُبھر کر وزارت داخلہ کی کرسی پر پہنچا تو اب تک کے سارے لاگ لپیٹ کو ختم کر کے اعلان کر دیا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کا کوئی سوال نہیں، اس کے لیے جدوجہد کرنے والی ایک منظم جماعت کے لیے کراچی میں ارشاد ہوا کہ یہ جماعت اگر اپنی سرگرمیوں کو مذہبی معاملات تک محدود نہیں کرے گی تو اس کے ساتھ سختی سے پیش آیا جائے گا، اور لکھنؤ کے ہوائی اڈے پر اس نعرۂ حق کو بلند کرنے والے تمام علماء کے متعلق شاعرانہ زبان اور نادر شاہانہ انداز میں فرمایا گیا کہ ان سب کو چاندی کی کشتی میں لگا کر ہندوستان بھیج دوں گا۔

الغرض اب تک جو چیز دلوں میں تھی وہ زبان پر آگئی ہے۔ نفاق کے پردوں میں جو کچھ نہاں تھا وُہ عیاں ہو گیا ہے اور بلاشبہ یہ پاکستانی قیادت کی سچی ترجمانی ہے جو اسکندر مرزا صاحب نے کی ہے اور اس لحاظ سے اسکندر مرزا صاحب پاکستانی کابینہ کے سب سے زیادہ قابلِ قدر رکن ہیں کہ انہوں نے بات صاف صاف کہدی ―― لیکن ایک بات میں مرزا صاحب بھی اپنے اکابر ہی کی تقلید کر گئے" کیا اچھا ہوتا کہ وہاں بھی وہ بات صاف ہی کہہ جاتے۔ انہوں نے اسلامی حکومت قائم کرنے کے سوال کو اس لیے غلط قرار دیا کہ تیرہ سو برس کے عرصہ میں کہیں دنیا میں اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی، حالانکہ بات اگر وہ صاف صاف کہتے تو یوں کہتے کہ ہم نہیں چاہتے، اس لیے اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکتی اس بات کو خواہ کوئی بُرا سمجھتا مگر غلط قرار نہیں دے سکتا تھا بخلاف اس دلیل کے جو انہوں نے پیش کی کہ اس کو تو بجز اپنا جرم ہلکا کرنے کی کوشش کے اور کچھ نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لیے کہ بحیثیت دلیل کے اس کا کوئی وزن نہیں! ―― اوّلاً اس لیے کہ یہ بات واقعہ کے اعتبار سے بالکل غلط ہے! انہوں نے شاید خلافتِ راشدہ اور اسلامی حکومت کو ہم معنی سمجھا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اسلامی حکومت تو مسلمانوں کی ہر وہ حکومت ہے جس میں اللہ و رسول کے احکام کو قانونی حیثیت حاصل ہو، بخلاف خلافتِ راشدہ کے کہ

وہ تو اس حکومت کا ایک انتہائی مثالی نمونہ ہے جس میں صرف اسلامی قانون ہی نافذ نہیں کیا جاتا بلکہ نبوت کی پوری نیابت کی جاتی ہے اور خلیفہ نبی کے ایک ایک قدم سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرتا ہے ـــــ یہ صورت یقیناً اسلامی حکومت میں زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکی، مگر جہاں تک اسلامی قانون کو قانونِ مملکت کی حیثیت حاصل ہونے کا تعلق ہے تو یہ بات تو اموی دور میں بھی رہی، عباسی دور میں بھی رہی، اور عثمانی ترکوں کے دور میں بھی رہی! یہ الگ بات ہے کہ اس پر عمل پورا پورا رہا یا نہیں۔ اگر نہیں رہا ـــ اور ہمیں تسلیم ہے کہ نہیں رہا ـــ تو کون ہے کہ دیانت داری کے ساتھ کہہ سکے کہ اس میں اس قانون کا کوئی قصور تھا؟ یہ تو سب اس نظامِ حکومت میں ایک غیر اسلامی شئے (ملوکیت) کا قلم لگنے کا طفیل تھا کہ یہ قانون اپنی پوری روح اور تمام وسعتوں کے ساتھ نافذ نہیں رہ سکا ـــ اور آپ سے اس وقت "آں ہم گردن زدنی" علماء کا مطالبہ اس سے زیادہ کب ہے کہ آپ پاکستان کے آئین کے لیے قرآن و حدیث کو بنیاد تسلیم کر لیجیے تاکہ اس کی بنیاد پر مملکت کا قانون اسلامی قانون ہو سکے۔ رہا اس کو عمل میں لانے کا مسئلہ؟ تو نہ وہ پہلے ناقابلِ عمل تھا اور نہ اب ناقابلِ عمل ہے۔ بلکہ یہ اُن لوگوں پر موقوف ہے جن کے ہاتھ میں اس قانون کا نفاذ ہو! اگر وہ لوگ باہمت ہوئے تو یہ من وعن نافذ ہو گا جیسا کہ پہلے ہُوا ہے اور اگر کم ہمت، نفس پرست اور بندگانِ عیش و طرب ہوئے تو اس میں رخنے پڑیں گے جیسے کہ پہلے پڑے۔

الغرض اوّلاً تو یہ بات ہی غلط ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد پورے تیرہ سو برس کے عرصہ میں کسی حکومت کا آئین و قانون اسلامی نہیں رہا۔ دوسرے اگر یہ صحیح بھی ہو تو یہ آخر اس بات کی دلیل کیسے بن سکتی ہے کہ ہو بھی نہیں سکتا؟ اسکندر مرزا صاحب تاریخ سے ایسی کوئی ایک مثال پیش کریں کہ فلاں حکمران نے چاہا کہ اس کی حکومت کا قانون اسلامی ہو مگر تجربہ سے ثابت ہُوا کہ یہ ناقابلِ عمل اور نامناسب ہے! ہمارا دعویٰ ہے کہ تاریخ کے تمام دفتر چھان لینے کے بعد بھی ایسی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ اس کے برعکس ہم آج بیسویں صدی میں ایک ایسے ملک کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں جس نے اسلام کے قوانین پر عملدرآمد شروع کیا تو ہندوستان جیسی غیر اسلامی اور سیکلر اسٹیٹ کا وفد اس کے نتائج دیکھ انگشت بدنداں رہ گیا۔

اور اس نے اپنے ملک میں آکر بے ساختہ اس تاثر کا اظہار کیا کہ ہم نے اس فتنہ و فساد سے بھری ہوئی دنیا میں ایک گہوارۂ امن و امان دیکھا ہے ـــ یہ ملک سعودی عرب ہے:

اسلامی نظامِ حکومت تو خیر صدہا برس تک اس دنیا میں قائم رہ چکا ہے اور نہ صرف قائم رہ چکا ہے بلکہ اس کا آئیڈیل تک عالمِ وجود میں آچکا ہے اور یہ فخر تنہا نظامِ اسلامی ہی کو حاصل ہے ورنہ دنیا میں جتنے بھی نظام فلاحِ انسانی کے لیے پیش کیے گئے ان کا آئیڈیل ہمیشہ پیش کرنے والوں کے تصور ہی میں رہا۔ تصور سے نکل کر عالمِ وجود میں کبھی نہیں آسکا۔ آج بھی کمیونزم اور جمہوریت جو ساری دنیا پر چھائے ہوئے ہیں اپنے آئیڈیل کا چہرہ دیکھنے کے لیے ترستے ہیں اور یقین ہے کہ عمر بھر ترستے ہی رہیں گے۔ پس ایک ایسے نظام کا تو سوال ہی کیا یہ دلیل تو کسی ایسے نظام کے مقابلہ میں بھی غلط ہے جس کا سرے سے کبھی وجود ہی نہ ہوا ہو اور وہ محض عالمِ تخیل میں ہو ـــ اور اگر یہ دلیل کوئی دلیل ہوتی تو دنیا میں کسی شخص کو کوئی نئی بات پیش کرنے کی کبھی جرأت نہ ہوتی اور انسان ترقی کی طرف ایک قدم بھی نہ بڑھا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ خواہ یہ مانا جائے کہ تیرہ سو برس تک بیشتر حصہ میں زمین کے ایک بڑے حصے پر اسلامی قانون کو قانونِ حکومت کی حیثیت حاصل رہی اگرچہ اس پر پورا عمل نہیں ہوا۔ یا یہ مانا جائے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد کسی حکومت کا دستور و قانون اسلامی نہیں رہا۔ ان دونوں میں سے کوئی بات بھی اس نتیجہ پر نہیں پہنچاتی کہ اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔ یہ نتیجہ تو جب صحیح ہو سکتا ہے جبکہ کچھ مثالیں اس قسم کی پیش کی جائیں کہ فلاں حکومت نے اپنا دستور و قانون اسلامی بنانا چاہا مگر وہ ناکام رہی یا اس پر عملدرآمد کیا گیا تو عوام نے اسے اپنے لیے مضر اور ناقابلِ قبول قرار دیا۔ مگر اسلامی تاریخ کا ہر طالبِ علم جانتا ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا، نہ کسی حکومت نے نیک نیتی کے ساتھ ارادہ کرنے کے بعد قرآن و حدیث کو ناقابلِ عمل پایا اور نہ اس کے عوام نے اسلامی قانون کو ناقابلِ قبول قرار دیا بلکہ ہمیشہ اس کے لیے اپنی آغوش وا کر دی، اور علی الرأس والعین کہہ کر استقبال کیا۔ البتہ ایک چھوٹا سا گروہ ضرور ایسا نظر آتا ہے جس کے حلق سے اسلامی قانون نہیں اترتا تھا کیونکہ یہ قانون اس کی ناجائز خواہشات کی راہ میں سنگِ گراں تھا یہی گروہ تھا جس نے عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زہر کا پیالہ دیا کیونکہ انہوں نے ساٹھ سال کے بعد حکومت میں

پھر خلافت راشدہ کا رنگ بھر آتا تھا اور اس گروہ کی ناجائز خواہشات کا راستہ بند کر دیا تھا اور آج بھی یہی گروہ ہے جو اسکندر مرزا جیسے لوگوں کی شکل میں مسلمانوں میں موجود ہے جو سمجھتا ہے کہ اسلامی دستور اور اسلامی قانون اس کی ناجائز خواہشات کے لیے موت کا پیغام ہے! — پہلے زمانہ کے اس گروہ نے (جو خاندانِ خلافت اور امراء پر مشتمل تھا) اسلامی قانون کی کوئی مخالفت نہیں کی بلکہ صرف اُن افراد کو ہٹانا کافی سمجھا جو اس قانون کو اس کی پوری روح کے ساتھ نافذ کرنا چاہتے تھے کیونکہ مطلق العنانی کے اس دور میں یہ بات آسان تھی کہ ملک کا قانون تو اسلامی ہے مگر اصحابِ اقتدار اپنی پرائیویٹ زندگی میں اور اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے جو چاہیں کریں۔ وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہ تھے مگر اس زمانہ کا یہ گروہ جانتا ہے کہ اب صورتِ حال مختلف ہے۔ مطلق العنانی کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب عوام کا ایک ایک فرد حکمراں کی زندگی کا احتساب کر سکتا ہے، الیکشن کے ذریعہ ہر چند سال بعد حکومت کو بدلا جا سکتا ہے۔ اس لیے وہ سرے سے اسلامی دستور اور قانون ہی کا راستہ روکنا چاہتا ہے، مگر دلائل کی طاقت سے محروم ہونے کی بنا پر اس قسم کی لچر اور مغالطہ آمیز باتیں کہہ کر اپنے رویہ کو حق بجانب ثابت کرنا چاہتا ہے کہ تیرہ سو برس میں کہیں اسلامی حکومت قائم ہوئی بھی ہے اور جب ان باتوں سے کام چلتا نہیں دیکھتا تو نشۂ قوت میں مدہوش ہو کر تشدد کی دھمکیاں دینے لگتا ہے اور کچھ الزامات تراش کر اپنے اس آخری ہتھیار کو استعمال کر ڈالتا ہے۔

ہم نے اسکندر مرزا صاحب کی دلیل پر جو کچھ کہا ہے وہ اس خیال کی بنیاد پر کہا ہے کہ وہ خلافتِ راشدہ کے قرآنی حکومت ہونے سے انکاری نہیں ہیں اور تیرہ سو سال سے ان کی مراد اس کے بعد سے ہے لیکن اگر ان کے انکار میں خلافتِ راشدہ کا دور بھی داخل ہے جیسا کہ اکثر حضرات نے سمجھا ہے تو پھر کچھ بعید نہیں کہ کل کو اگر کہیں کوئی دن میں شراب نوشی کرتے ہوئے دیکھے اور کہے کہ حضرت آپ نے تو فرمایا تھا کہ "میں سچا مسلمان ہوں اور غروبِ آفتاب سے قبل کبھی شراب نہیں پیتا" تو وہ جواب میں کہہ دیں کہ اس دنیا پر کبھی آفتاب طلوع ہوا بھی؟ — یقیناً وہ اتنے جری ہیں کہ دن کو رات اور رات کو دن، سپید کو سیاہ اور سیاہ کو سپید کہہ دیں اور وہ ہستی کے نشہ میں سمجھ لیں کہ حقائق ان کی زبان کے تابع ہیں — اس موڈ کا آدمی قطعی طور پر مرفوع القلم ہے اور ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس کی کسی بات کا نوٹس لیا جائے اور اسے کوئی سنجیدہ جواب دیا جائے۔

سُنّت اور تجدّد

مسٹر فرید جعفری کے خیالات کا عقلی جائزہ

(نعیم صدیقی)

ہمارا معاشرہ جن دو بنیادوں پر قائم ہے اُن میں سے ایک خدائے واحد کا اقتدار برتر ہے جو ہمیں زندگی کی فلاح کے بنیادی اصول اور اجتماعی ضابطہ فراہم کرتا ہے، اور اس کے ساتھ دوسری بنیاد خدائے واحد کے نامزد کردہ مستند نمائندہ یعنی رسول صلعم کی اتھارٹی ہے جو ضابطۂ خداوندی کی فیصلہ کن تعبیر اور اس کا عملی نمونہ ہمارے سامنے لاتی ہے۔ ان میں سے جس ایک کو متزلزل کر دیا جائے، دوسری اس کے ساتھ از خود تباہ ہو جاتی ہے مسلمان قوموں اور معاشروں کی اجتماعی ہیئت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنی ان دو بنیادوں کا تحفظ کریں۔ دوسری طرف ہر تخریبی طاقت واحد راہِ عمل یہی پاتی ہے کہ ان دونوں یا ان میں سے کسی ایک بنیاد کو اکھیڑ دیں۔ چنانچہ تمام کے تمام فتنے جنہوں نے ملت کو بار بار جھنجوڑ ڈالا ہے وہی تھے جو یا تو ہمارے عقیدۂ توحید پر حملہ آور ہوئے ہیں، یا ہمارے ایمان بالرسالۃ پر! باقی ساری چیزیں بالکل سرسری درجے میں خلل انداز ہو سکی ہیں۔ پھر ان دو گونہ فتنوں کا اگر پورا پورا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مخالفانہ حملوں کی زد پر آنے کے لحاظ سے رسالت بہت زیادہ مظلوم رہی ہے۔ رسول کا منصب، رسول کی اتھارٹی، رسول کا اسوہ اور رسول کی سنت کے بارے میں مخالفِ اسلام رجحانات کا اندازہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ادھر سے حملہ زیادہ آسان ہے۔ خدا کی ہستی، خدا کے حقوق و صفات، خدا کے قانون اور خدا کی کتاب سے لڑائی لڑتا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ آدمی دائرۂ اسلام سے باہر جا کھڑا ہو۔ لیکن رسالت پر حملہ آور ہونے کے لیے ایسے مورچے با سانی مل سکتے ہیں کہ جن سے وار کر کے خدا کے دین اور اسلامی شریعت کے بے شمار تقاضوں کا صفایا کیا جا سکتا ہے اور پھر اپنے آپ کو نہایت شاندار قسم کا مسلمان — بلکہ ماڈرن اور ترقی پسند مسلمان — بنا کے رکھا جا سکتا ہے۔

رسالت کے منصب و حقوق پر اولین حملہ منافقین مدینہ کا تھا۔ یہ لوگ خدا اور اس کی کتاب کو

بظاہر واجب الاطاعت مانتے تھے، لیکن رسول کی یہ اتھارٹی ماننے پر تیار نہیں تھے کہ اس کی بارگاہ سے جو تعبیر احکامِ الٰہی کی کر دی جائے، جو عملی نمونہ قائم کیا جائے، جو تصفیہ معاملات کیا جائے اور جو احکام بنا رکھ دیے جائیں وہ بھی کوئی دینی و شرعی قدر و قیمت رکھتے ہیں اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا لازم ہے۔ انکارِ سنت کا یہ اوّلین اقدام تھا جو ہمارے معاشرہ میں کیا گیا۔ رسالت پر دوسرا بڑا حملہ نظریۂ امامت کے حاملین کا تھا جنہوں نے امامت کا منصب رسالت سے کاٹ کر الگ کر دیا اور اسے رسالت سے برتر قرار دیا۔ اس نظریہ کا منطقی نتیجہ رسالت کے فائنل اتھارٹی ہونے کی نفی تھا۔ پھر خوارج تھے جنہوں نے دین کی "اجتماعی ہیئت" کو ایک دینی عامل اور لازمہ ماننے سے انکار کر کے درحقیقت رسالت کے مجموعی عملی نمونہ پر خطِ نسخ کھینچ دیا۔ پھر رسالت ہی کی اتھارٹی کو تباہ کرنے کے لیے ہمارے ایک بڑے تاریخی گروہ نے سنت کے ریکارڈ کے بالمقابل (PARALLEL) ایک جعلی ریکارڈ میدان میں ڈال دیا، تاکہ یہ سرمایۂ شریعت مشکوک و مشتبہ ہو کر رہ جائے۔ پھر معتزلہ اٹھے جنہوں نے منطق و استدلال کے یونانی سانچے لیے اور ان میں اپنے معتقدات کو ڈھالنے کی مہم شروع کی۔ ان سانچوں سے قرآن و حدیث دونوں ٹکراتے تھے۔ پس قرآن کی حد تک تو انہوں نے یہ طور اختیار کیا کہ جو آیات ان کے ذہنی معیارات کا ساتھ نہیں دے سکتی تھیں ان کو تاویل سے چھیل ڈالا۔ لیکن جو احادیث ایک طرف اس طرح کی تاویل میں رکاوٹ بنتی تھیں اور دوسری طرف ان کے معیارات سے ٹکراتی تھیں اُن کو ماننے سے انکار کر دیا۔ یعنی بجائے اس کے کہ رسولؐ کے ارشادات ان کے افکار و تاویلات کے اوپر اتھارٹی ہوتے۔ انہوں نے اپنے ذہنی معیارات کو خود قرآن و حدیث کے اوپر اتھارٹی بنا ڈالا۔

رسالت کے منصب و حقوق پر جہاں یہ شبخون اندر سے مارے جا رہے تھے، وہاں بالکل ابتداء ہی سے کھلے کھلے حملے سامنے سے بھی شروع ہو گئے۔ یعنی مسلمانوں کو مدعیانِ نبوت سے پے در پے سابقہ پڑا۔ خدا کے اقتدارِ برتر کا قلادہ گردن سے نکالنے کے لیے خدائی کا دعویٰ اتنا کامیاب حربہ نہیں جتنا رسول کی اتھارٹی کے بندھن سے نجات پانے کے لیے ادعائے نبوت کا علم بلند کرنا ہو سکتا ہے۔ اس طریقہ سے نبوت کی دیوار توڑ کر آگے خدا کے اقتدارِ برتر میں با آسانی نقب لگائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ طلیحہ

سجاح، مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، بعد میں باب ایرانی اور دورِ حاضر میں مرزا غلام احمد قادیانی نے یہی راستہ اختیار کیا۔ لیکن ہمارا معاشرہ ان کھلے اور چھپے، سامنے کے اور پیچھے کے، باہر سے ہونے والے اور اندر سے ہونے والے سارے حملوں کا سدِ باب کرتا چلا آرہا ہے۔

منصبِ رسالت اور حقوقِ رسالت پر تازہ ترین حملہ کی ابتدا عبداللہ چکڑالوی نے کی اور پھر اسے چند ذہین حضرات نے جدیدیت کے رنگ میں رنگ کر اس میں ممکن حد تک عقلی زور پیدا کیا۔ عبداللہ چکڑالوی جیسے لوگ مناظرانہ ذہنیت سے اوپر ہو کر سوچنے کے قابل نہیں ہوتے، لیکن حافظ اسلم جیراجپوری جیسے لوگوں کی ذہانت نے انکارِ سنت کو ایک علمی بحث کی سطح تک پہنچا دیا۔ اسی دوران میں ایک اور ذہین تر آدمی اسٹیج پر نمودار ہوتا ہے جو ذہن و فکر کے لحاظ سے انتہائی مغرب زدہ طبقے اور ماحول سے وابستہ تھا۔ اس طبقے اور ماحول میں دین سے فراریت کا رجحان نمایاں تھا۔ اس ذہین تر آدمی نے اپنے طبقے کی نفسیاتی کیفیت کا خوب اچھی طرح جائزہ لے کر انکارِ سنت کا نظریہ ایک ایسے نئے انداز سے اٹھایا کہ جو اس خاص طبقے کو اپیل کر سکے۔ اس طبقے کا لاینحل مسئلہ یہ تھا کہ ایک طرف یہ اسلام سے منسوب بھی رہنا چاہتا ہے اور دوسری طرف مغربی فلسفہ اور جدید تمدن اور کلچر کو اس کے جملہ مفاسد سمیت اپنانا بھی چاہتا ہے۔ اس لاینحل مسئلے کا نہایت سہل حل سنتِ رسول کا انکار تھا جسے اس ذہین تر آدمی نے ان کے سامنے لا کے رکھ دیا کہ رند کے رند بھی رہو اور ہاتھ سے جنت بھی نہ جائے۔ اس طرح رسالت پر ایک نیا حملہ کرنے کے لیے وہ مستقل انسٹی ٹیوشن ہمارے ہاں پروان چڑھا ہے جس کا محور ادارۂ طلوعِ اسلام ہے۔

پاکستان بنا تو قدرتی طور پر قوم کے اجتماعی ذہن نے زور کیا کہ اس نئی اسلامی مملکت کی دستوری اساس معین ہو جائے۔ چنانچہ ہمارے معاشرے کی جو اعتقادی بنیادیں صدیوں سے قائم تھیں انھوں نے اپنے آپ کو "قراردادِ مقاصد" میں نمایاں کر دیا۔ قراردادِ مقاصد یہ کہتی ہے کہ خدا کی حاکمیت کی بنیاد پر اسلامی شریعت و قانون کا نظام پاکستان میں چلے گا اور اس شریعت و قانون کے مآخذ کتاب و سنت ہوں گے۔ جمہوریت، عدل، مساوات اور معاشرتی انصاف کے وہی اسلامی تصورات واجب القبول

ہیں جو قرآن و حدیث کی تعلیم پر مبنی ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ اظہار معاشرہ کے اجتماعی ذہن — جس سے چند افراد کو چاہے کتنا ہی اختلاف ہو — کی صحیح صحیح ترجمانی ہے۔ چنانچہ اس دستوری اظہار پر سارے ملک میں ایک اطمینان کی کیفیت پیدا ہو گئی اور جدید اور قدیم سارے عناصر اس پر متفق ہو گئے۔ اس نے مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور خان لیاقت خاں مرحوم کے ذہنوں کو ہم آہنگ کر دیا جو دو مختلف عناصر کے اونچے درجے کے نمائندے تھے۔

اس قرارداد کے پاس ہو جانے پر اس پر سب سے پہلا حملہ منکرین حدیث ہی نے کیا۔ اور اس حملہ کا تسلسل اب تک قائم ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس میں جو لفظ سنت آ گیا ہے اس کے خلاف بار بار پیچ و تاب دکھایا جا رہا ہے۔

یہ مظلوم قراردادِ مقاصد جو صرف ہماری اکثریت ہی کے رجحانات کی نہیں، معاشرہ کے اجتماعی ذہن کی ترجمان ہے، اب اپنے اندر لفظ "سنت" کو شامل رکھنے ہی کی وجہ سے ایک نئے وار کی ہدف بنی ہے۔ یہ وار کراچی کے انگریزی روزنامے "پاکستان اسٹینڈرڈ" کی طرف سے کیا گیا ہے جو ٹھیک اسی مسلم لیگ کا نمائندہ اخبار ہے جس کے دورِ اقتدار میں قراردادِ مقاصد پاس ہوئی تھی۔ یہ تازہ وار جو قراردادِ مقاصد، سنت کے انسٹی ٹیوشن اور "ملا" سب کو بیک دم ہدف بناتا ہے ایک ایسا حادثہ ثابت ہوا کہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس پر ہل چل مچ گئی۔ یہ ایک تجرباتی حقیقت ہے کہ معاشرہ کی ایک بنیاد کو جب چھیڑا جاتا ہے تو بسا اوقات فوری ردِ عمل کے طور پر ایک جذباتی ہیجان کی مدافعت کے لیے برسرِ کار آ جاتا ہے۔ ایسا ہونا بالکل فطری تھا اور ہوا۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ نہایت ٹھنڈے طریق سے شعوری اور استدلالی لحاظ سے بھی اس کا سامنا کیا جائے۔

فرید جعفری صاحب کے ارشادات پہلے ہم پاکستان اسٹینڈرڈ سے اس کے مدیر فرید جعفری صاحب کے خیالات کو اردو ترجمہ میں پیش کرتے ہیں:-

"ان (یعنی قائد اعظم) کی ایک غلطی یہ تھی کہ انہوں نے ان مذہبی لوگوں کو کچھ اہمیت دے دی اور ان پر کچھ مہربانی کر دی جو تحریکِ پاکستان کے دنوں میں ان کے اور ان کے مقصد کے وفادار رہے تھے۔ ان

لوگوں کو آزادی کے ابتدائی سالوں میں نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ اور اگر ایسا کیا جاتا تو خانہ جنگی کا خطرہ تھا۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو مجلس دستور ساز نے قرارداد مقاصد کی شکل میں قوم سے ایک پیمان کیا، ملاؤں کو فتح حاصل ہوگئی۔ یہ پاکستان میں ملا راج کی ابتدا تھی۔ اب اس کے بعد ہم مذہبی لوگوں کے لیے لفظ ملا کا استعمال کریں گے، کیونکہ جونہی سنت کا لفظ شامل کیا گیا، ملا ازم نے ملک میں سر اٹھا لیا۔ ملا ازم اتنی ہی خطرناک طاقت بن گیا جتنی اشتراکیت تھی۔ سنت (رسول کی روایات) کی تعیین کرنے کا حق کسے تھا؟ پاکستان میں اسلام کا دعویٰ کرنے والے بہتر (۷۲) سے زائد فرقے تھے۔ ان میں سے ہر ایک قرآن کی اپنی سی تعبیر کرتا تھا، اور یہ ساری تعبیریں سنت کی روشنی میں کی جاتی تھیں۔ اس لفظِ سنت کا شمول تجدد پسندوں کے لیے پیغام موت تھا، اور اس کی وجہ سے مذہبی تحریک کا اپنے پورے زور و شور اور شیطنت کے ساتھ آغاز ہوگیا۔ تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی تھی۔ یہ سنت ہی تھی جس نے اسلام کے ابتدائی جمہوری مزاج میں بگاڑ پیدا کیا۔ یہ سنت ہی تھی جس نے مسلمانوں کو متعدد فرقوں میں ٹکڑے ٹکڑے کرکے ان کی وحدت کو پارہ پارہ کیا۔ یہ سنت ہی تھی جس نے بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں مذہبی لوگوں کو غیر معمولی اہمیت دلوائی، اور یہ سنت ہی تھی جس نے دولتِ عثمانیہ کو ناقابلِ علاج وگیوں کا گھر بنا دیا۔ کوئی دو ماہر رسولؐ کی روایات کی تعبیر کے معاملے میں کبھی متفق نہیں ہو سکے۔

اس عبارت کو براہِ کرم ایک بار، دو بار، چار بار توجہ سے پڑھیے اور لفظوں کے اس ڈھیر میں عقلی استدلال کی جستجو کیجیے۔ آپ کو اندھی جذباتیت کے سوا اس میں سے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ یہ عبارت ایک اشتعال اور ایک جھنجھلاہٹ سے زائد کوئی چیز پیش نہیں کرتی۔ لکھنے والے کے دل کا ایک اُبال ہے جسے اِن الفاظ میں اُگل دیا گیا ہے۔ جس عنصر کا ذہن اس عبارت میں منعکس ہو رہا ہے اس کے ذہنی افلاس کا پورا پورا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ شان تنہا اسی عبارت کی نہیں ہے، گزشتہ سات سال میں اسلامی فکر کے خلاف حضراتِ متجددین نے جتنی لڑائی بھی لڑی ہے اسی طرح کے اوچھے ہتھیاروں سے لڑی ہے۔ وہ ہمیشہ دلائل کے مقابلے میں تند جذباتیت لے کے آئے ہیں اور ان کی تند جذباتیت کا سامنا مقہور و مغضوب ملا نے جب بھی کیا ہے مُسکت استدلال سے کیا ہے فکری

کشمکش کے ان چند سالوں میں متجددین کی عقلیت کی ساکھ پوری طرح ختم ہو گئی ہے۔ عقل و استدلال کے اسی دیوالیہ پن کا نتیجہ ہے کہ آج ملک کے سیاسی اسٹیج پر یہ تجدد پسند عنصر ایسے ایسے مضحکہ انگیز کھیل دکھا رہا ہے کہ اپنے نالاں ہیں اور پرائے ہنسی اڑا رہے ہیں۔

دوسری چیز جو اس عبارت کو پڑھتے ہی نمایاں ہو جاتی ہے وہ سیاسی میدان پر بلا شرکت غیرے ہمیشہ کے لیے اجارہ دارانہ قبضہ جمائے رکھنے کا حیوانی جذبہ ہے جو تجدد پسند عنصر کی ساری نفسیاتی الجھنوں کا مرکز ہے۔ قرارداد مقاصد کے پاس ہونے میں ملّاؤں کی فتح کی بُو سونگھنا، ملّا راج کے خطرے کو سر اٹھاتے دیکھنا، اس حادثے میں تجدد پسندوں کی موت کے آثار پا لینا اور پھر اس پر اضطراب دکھانا اس بات کی کھلی کھلی شہادت ہے کہ فرید جعفری صاحب پاکستان کے اقتدار کو اپنے مختصر سے عنصر کے لیے آبائی جاگیر سمجھتے ہیں۔ اس جاگیر کے حقوق مالکانہ میں اگر کوئی اور عنصر بھی شریک ہوتا ہے یا اس کے نظم و نسق میں کسی پہلو سے مداخلت کا حق پا لیتا ہے تو فرید جعفری صاحب کے مالکانہ اور اجارہ دارانہ جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور اس عالم اشتعال میں وہ بغیر سوچے سمجھے جو کچھ زبان پر آتا ہے کہتے چلے جاتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر یہاں اشتراکیت نظام زندگی پر کسی درجے میں بھی اثر انداز ہو گی تو لازماً وہ عناصر سیاسی اہمیت حاصل کریں گے جن کا کوئی ربط اشتراکی فکر سے ہو گا، یہاں اگر جمہوری قدریں زور پکڑیں گی تو لازماً جمہوریت پسندوں کا سیاسی وزن بڑھے گا اسی طرح یہاں اگر اسلام کا کوئی جزء — باوجود تعبیری اختلافات کے — ہمارے دستور اور ہمارے نظام معاشرہ میں نمودار ہو گا تو اس کے نتیجے میں اسلام سے علمی یا سیاسی وابستگی رکھنے والے عناصر کو سیاسی لحاظ سے کچھ نہ کچھ قوت حاصل ہو کے رہے گی لیکن فرید جعفری صاحب کا ذہن اس عبارت میں بول بول کر یہ کہہ رہا ہے کہ اگر اسلام کے آنے سے ہمارے ہوتے ہوئے کسی دوسرے عنصر کو کوئی اہمیت حاصل ہوتی ہے تو پھر اسلام کو سات سلام! ملک اسلام کا کتنا ہی طلبگار ہو، ہماری ملّی تاریخ اسے بطورِ نظام اپنانے کے لیے کتنا ہی زور لگائے، قوم کو اس سے فلاح و بہبود کی کتنی ہی توقعات ہوں، عوام کا اجتماعی ارادہ اسے کتنی ہی والہانہ عقیدت کے ساتھ بُلا رہا ہو لیکن وہ اگر فرید جعفری صاحب اور ان کے ہم مفاد لوگوں کے خدائی حقوق کو متزلزل کر دے تو وہ لڑ مریں گے لیکن اسے زندگی کے دروازے سے کبھی داخل

نہ ہونے دیں گے۔ یہ وہ ذہنیت ہے جو تقریباً تمام کے تمام متجددین میں یکساں کارفرما ہے جو کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے اسلام کے دستوری و سیاسی تصورات میں ٹیڑھ نکالتے رہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنی جھنجھلاہٹ کا زور مُلّا پر صرف کرتے رہتے ہیں۔ اِس ذہنیت سے کسی استدلالی مواد کی توقع نہیں کی جاسکتی بلکہ اس کا ظہور ہمیشہ جذباتی اُبال ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے جذباتی اُبال کا ردِ عمل عوام میں بھی جذباتی انداز سے رُونما ہوتا ہے۔ تاہم ہمارا مقام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس طرح کے جذباتی ابال کے جواب میں بھی عقلیت اور استدلال سے کام لے کر فرید جعفری صاحب کو اپنے طرزِ فکر پر عقلی انداز سے نظرِثانی کی دعوت دیں۔

قائداعظم پر بے جا تنقید قائداعظم کا نام اِن حلقوں میں جن جا و بے جا طریقوں سے استعمال ہوتا رہا اس کے مقابلے میں آپ یہ نیا انداز دیکھ رہے ہیں کہ اب مرحوم کی غلطیاں پکڑی جانے لگی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ جس شے کو قائداعظم کا گناہ قرار دیا جا رہا ہے وہی قائدِاعظم کا عظیم ترین کارنامہ ہے۔ ایک باکمال لیڈر جب کوئی تحریک لے کے اُٹھتا ہے تو وہ ہمیشہ اپنی حکمت و بصیرت سے ایسی تدبیریں نکالتا ہے کہ ایک قوم و معاشرہ کے گوناگوں عناصر کو وہ کسی ایک مرکزی نقطہ پر جمع کرکے ساتھ لے سکے اور آہستہ آہستہ ایک متحدہ محاذ اپنے نصب العین کے حق میں پیدا کر دے۔ تاریخی کارنامے وہی لیڈر سرانجام دے سکتے ہیں جو یہ تقاضا پورا کر لے جائیں۔ اور زمانہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ قائداعظم نے یہ تقاضا پورا کر دیا اور اس سے وہ نتیجہ رونما ہو گیا جو پیشِ نظر تھا۔ ہمارے معاشرہ میں ایک طرف انگریزی امپیریلزم کی زنجیروں سے نجات پانے کا داعیہ کارفرما تھا، دوسری طرف ہندوستانی متحدہ قومیت کے دام سے بچ نکلنے کی تڑپ موجود تھی، تیسری طرف اسلامی اصولوں پر زندگی کی تعمیرِ نو کا ولولہ دلوں میں اٹھنے لگا تھا۔ معاشرہ کے ان سارے داعیات و رجحانات کو قائداعظم نے ایک ہی تحریک —— تحریکِ پاکستان —— میں جمع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف سے جدید عناصر آگے بڑھے، دوسری طرف سے دینی عناصر نے لبیک کہی اور وہ متحدہ طاقت وجود میں آئی جس نے چند سال میں زمین کے نقشے پر ایک نئی مملکت کا اضافہ کر دیا۔ بلکہ فرید جعفری صاحب کو ہم یہ یاد دلانا چاہتے ہیں کہ جب تک قائداعظم تنہا جدید عنصر کو

ساتھ لے کر چل رہے تھے مسلم لیگ ایک غیر اہم وجود کی حیثیت سے دن گذار رہی تھی، یہ تحریک پاکستان کی صورت میں عوامی طاقت اس روز بن سکی جس روز جدید عنصر کے ساتھ دینی عنصر بھی آ ملا۔ قائد اعظم کی اس "غلطی" سے برسر اقتدار طبقے نے جونہی توبہ فرمالی اور دینی عناصر کے خلاف کشمکش کا آغاز فرما دیا اسی لمحے مسلم لیگ کا زوال بھی شروع ہو گیا اور برسر اقتدار طبقے کی عوامی مقبولیت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ قائد اعظم کے کیے کرائے کو اب آپ حضرات غارت کرنے پر تُل گئے ہیں اور متحدہ قومی طاقت کا شیرازہ درہم برہم ہونے لگا ہے۔ قائد اعظم کے طرزِ فکر کی روشنی میں خان لیاقت علی خاں مرحوم نے قرار داد مقاصد پاس کرائی اور اس کے ذریعے قوم کی طاقتوں کو جمع رکھنے کی سعی کی۔ چنانچہ یہ سعی بڑی حد تک کامیاب رہی۔ اب جبکہ خان لیاقت علی خاں کا سینہ ایک ظالم کی گولی نے چھلنی کر دیا، لوگوں کو یہ توفیق مل گئی ہے کہ وہ اس کے یادگار تاریخی کارنامے — قرار داد مقاصد — میں چھید کریں۔

بتایا گیا ہے کہ قائد اعظم نے مذہبی لوگوں پر بے جا طور پر کچھ مراحم خسروانہ فرما دیئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ مراحم خسروانہ کونسے ہیں جن کو دیکھ کر کسی کے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔ قائد اعظم نے کونسے مناصب مذہبی لوگوں میں بانٹ دیے تھے؟ کتنی ایک وزارتیں ان کو دے دی تھیں؟ کتنے ایک وظائف ان کے نام جاری فرما دیے تھے؟ کونسی جاگیریں ان کے نام لکھوا دی تھیں؟ ہمارے علم کے مطابق تو قائد اعظم نے یہ سارا خوان یغما جدید طبقے میں لٹوایا تھا۔ مذہبی لوگوں کو کیا ملا؟ صرف یہ کہ ایک مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو ساتھ رکھا؛ اور وہ بھی اس حد تک کہ مولانا عثمانی ایک فقیرانہ بے بسی کے عالم میں دن گذار گئے۔

مگر فرید جعفری صاحب کا ذہن مذکورہ بالا عبارت میں جس شان سے جلوہ گر ہے اس سے یہ بات ٹپکتی ہے کہ قائد اعظم نے دینی عناصر کو پوری طرح ٹھکرایا اور کچلا کیوں نہیں، جینا کیوں چھوڑ دیا! ان کی رائے کے لحاظ سے چاہیے یہ تھا کہ قائد اعظم تحریک کے انتہائی مشکل اور ادق مراحل میں علماء اور دینی عناصر سے کام لیتے، ان کو خوب استعمال کرتے، پھر جب کامیابی ہو جاتی تو خانہ جنگی کا خطرہ مول لے کر بھی ان کو صاف صاف طریق سے دھتا بتا دیتے اور اس قابل چھوڑ کر عالمِ فانی سے رخصت نہ ہوتے کہ وہ پاکستان کے بھلے برے کے متعلق کبھی زبان کھول سکیں۔ لیکن فرید جعفری صاحب، کو قائد اعظم جیسی اونچی شخصیت سے

اس میکیاولیانہ عیاری کی توقع کرنے کی گنجائش کہاں سے ملی!

پھر سوال یہ بھی ہے کہ آخر متجددین نے پاکستان کے مسلم معاشرہ کا جو نقشہ ذہن میں بنا رکھا ہے کیا اس میں وہ خود برہمن بن کے بیٹھنا چاہتے ہیں اور دینی عناصر کو اچھوت بنا کے رکھنا چاہتے ہیں؟ وہ کیا چیز ہے جسے پس منظر میں رکھتے ہوئے وہ یہاں ایک عیسائی، ایک ہندو، ایک ملحد، ایک موچی، ایک جولاہے کو تو حق دے سکتے ہیں کہ وہ اپنے سیاسی حقوق کا استعمال کرے، لیکن ہر وہ شخص جو اسلام کا علم حاصل کرے یا اس پر عمل کرنے کا قصوروار ہو جائے اسے وہ "ملا" قرار دے کر سرے سے سیاسی حقوق سے محروم کر دینا چاہتے ہیں؟ اور ہر کوئی بول سکتا ہے مگر ایک اسلامی نظام کا خواستگار دم مارنے کا حق نہیں رکھتا؟ اس کے لیے کونسی منطق آپ کے پاس ہے۔ کونسا سیاسی نظریہ ہے جسے آپ مدارِ فکر بناتے ہیں؟

ہم عرض کریں گے کہ دینی عناصر کو جو سیاسی اہمیت اپنے معاشرہ میں حاصل ہے وہ کسی کا عطیہ نہیں ہے، وہ کوئی خیرات نہیں ہے جو کسی منعم کی طرف سے اُن کی جھولی میں ڈالی گئی ہو، بلکہ یہ سب کچھ نتیجہ ہے اُن کے اس پارٹ کا جو وہ اپنی قوم کی بہبود کے لیے فکر و عمل کے میدان میں ادا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ نہ کسی کا عطیہ تھا، نہ اسے کوئی ان عناصر سے واپس سلب کر سکتا ہے۔ آج دینی عناصر کو "ملائیت" کے القاب دینے والا ذہن ایک طرف بے تحاشا گالیوں کی بوچھاڑ کر رہا ہے، دوسری طرف نظر بندی، زبان بندی، قید اور پھانسی کی سزاؤں سے ان کو نواز رہا ہے، لیکن یہ چیزیں اُلٹا ان کی سیاسی قدر و قیمت میں اضافہ کر رہی ہیں۔ آج پاکستان کا سارا کا سارا جدید عنصر جاہ و منصب کی جاگیر کے بٹوارے میں باہم دست بگریباں ہے اور ایک "ملا" ہے جو اپنی مخلصانہ دعوت اور اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے سچے جذبے میں سرشار قید و بند کے امتحانوں سے گذر رہا ہے۔ تخت پر بیٹھ کر مفاد کی پوجا کرنے والوں اور تختے پر کھڑے ہو کر حق کی صدا بلند کرنے والوں کا یہ فرق خود بخود ایک طاقت کو پستی کی طرف لے جا رہا ہے اور دوسری طاقت کو سیاسی اہمیت سے آراستہ کر رہا ہے۔ اس پوزیشن میں ہوتے ہوئے آپ غصے میں قائد اعظم کی قبر کی مٹی اکھیڑ کر نہ دینی عناصر کو اس کے مقام سے نیچے لا سکتے ہیں، نہ اپنا مرتبہ بڑھا سکتے ہیں۔

دینی عناصر کی جو کچھ قدر و قیمت بھی بنی ہے وہ دربار وں میں نہیں، رائے عام کے میدان میں بنی ہے وہ تحریکِ آزادی کے دوران میں بھی، تحریکِ پاکستان کے دوران میں بھی اور اب دستوری جدوجہد کے دوران میں بھی تمام عوامی طبقوں میں پہنچے ہیں، انہوں نے لوگوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو سنا اور لوگوں کے جذبوں کو سمجھا ہے، انہوں نے رُو در رُو ہو کر اپنا پیغام پہنچایا ہے۔ انہوں نے لوگوں کے سامنے اپنے دلائل رکھے ہیں، وہ اپنے عوام میں گھُلے ملے ہیں، ان کے شانہ بشانہ ہو کر چلے ہیں، اس فطری اور جمہوری طریق پر ان کو سیاسی وزن حاصل ہوا ہے۔ اخباری مقالوں میں جوش دکھا کر کون اس وزن کو ختم کر سکتا ہے!

ملاکریسی کا کوئی جرثومہ ہے کہاں؟ بظاہر اس عبارت کو پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے سے (خصوصاً اس میں لفظِ سنّت شامل ہونے کی صورت میں) علماء بہ حیثیتِ طبقہ ہماری سیاسی ہیئتِ تعمیر میں کوئی جگہ حاصل کر گئے ہیں۔ گویا کوئی مسلم کلیسیا موجود تھا جس نے اسٹیٹ کے نظامِ عمل میں ایک انسٹی ٹیوشن کے طور پر دخل حاصل کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر صورتِ واقعہ یہی ہو تو متجددین سے زیادہ اس میں اسلام کے خیر خواہوں کے لیے وجہِ اضطراب موجود ہے۔ اور اس صورت میں ہم متجددین کا جائز حق یہ مان لیں گے کہ وہ ہر اسلام پسند کو "ملا" اور "ملاازم" سے زیادہ کریہہ لفظوں میں گالی دیں۔ لیکن یہ ایک عجیب عالم ہے کہ جو شے واقعہ میں موجود نہیں ہے، اسے پروپگنڈہ سے موجود قرار دے کر اور اسے اپنے مبغوض عنصر سے منسوب کر کے پھر اس کے خلاف دل کا بخار نکالا جاتا ہے۔

قراردادِ مقاصد کے بیج سے جو دستوری نقشہ نمودار ہوا ہے اس میں کہیں خوردبین لگا کر دیکھنے سے بھی کوئی جرثومہ کسی مذہبی طبقے کی فرمانروائی کا دکھائی دیتا ہے؟ وہ چیز جسے فرید جعفری صاحب ملاکریسی (MULLAHCRACY) کی جدید اصطلاح سے موسوم فرما رہے ہیں، کہیں اس کا کوئی ہیولیٰ پیشِ نظر مسودۂ دستور میں یا کسی دینی جماعت کے مطالبہ و منشور میں پایا جاتا ہے؟ جہاں عوام کو آزادانہ طور پر اپنے نمائندے منتخب کر کے ان کے ذریعے حکومت خود اختیاری (SELF GOVT) چلانے کا کھلا کھلا موقع

دیا جا رہا ہو اور جہاں ہر آنے والے کو رائے عام کی رضامندی ہی سے آنے کا موقع ملے اور جہاں کسی طبقے کے طبقاتی حقوق کو دستوری نقشے میں شامل نہ کیا گیا ہو، وہاں ملاّ کریسی کا ہوّا خیال ہی خیال میں دیکھ کر چونک جانا اور اس پر شور مچا دینا کونسی معقولیت ہے! اور تو اور، بنیادی اصولوں کی رپورٹ میں "ملا بورڈ" کی جو تجویز رکھی گئی تھی اس کے خلاف آواز اٹھانے میں سب سے پیش پیش جماعت اسلامی تھی جو علماء کی ایک نمائندہ مجلس کے ترمیمی فیصلوں کی ترجمانی کر رہی تھی! آخر فرید جعفری صاحب بتائیں تو سہی کہ اس بیچارے لفظ سنت کے اندر سے ملاّ کریسی کا فتنہ کس طرف سے ابھرتا دکھائی دیتا ہے؟

ہاں اگر تشویش اس بات کی ہو کہ پاکستان میں کسی درجے میں بھی اسلامی نظام کے قیام کی صورت میں دینی عناصر کی وقعت خود رائے عام کے دائرے میں بڑھ جائے گی اور دینی رجحانات پبلک حلقوں میں زور پکڑ لیں گے اور اس کے نتیجے میں آہستہ آہستہ موجودہ توازن قوت بدلے گا اور اس کا اثر آج کی برسر اقتدار طاقت پر یک دم نہیں تو تدریجاً ضرور پڑیگا تو یہ گھبراہٹ بجا ہے لیکن یہ اندیشہ لفظ سنت کا مرہون منت نہیں، بلکہ اگر صرف قرآن یا اسلام کا نام بھی کہیں باقی رہے گا تو اس صورت میں بھی اس اندیشے سے نجات نہ ہو سکے گی۔ سنت کی تعبیر سے پیچھے ہٹ کر آپ معاملہ اگر قرآن کے احکام کی تعبیر پر بھی لے جائیں تو بھی اُن لوگوں کو اولیت دیے بغیر چارہ نہیں جو قرآن کا تحقیقی علم رکھتے ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ نہ قرآن کا علم حاصل کرنے کا اجارہ کسی طبقے کو حاصل ہے، نہ اس پر دادِ تحقیق دینا اور اس کی تعبیر کرنا کوئی موروثی پیشہ ہے، بلکہ ہر شخص کے لیے میدان کھلا ہے اور یہ حق جمہوری ہے۔ لیکن جو لوگ اس میدان میں عمریں کھپاتے ہیں اور کاوشیں کرتے ہیں ان کو اگر کسی تعصب کی وجہ سے پیچھے دھکیل کر نااہل لوگوں کو تعبیر احکام کی ذمہ داری سونپ دی جائے تو قرآن کی حکمت و قانون کا ایک ایک جزء مضحکہ بن کے رہ جائے گا۔ ایک مثال کے طور پر مروجہ قانون کو لے لیجیے۔ اس قانون میں علم و تحقیق کرنا کسی طبقے کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ ہر فرد کو حق ہے کہ جائے اور محنت و کاوش سے اس میدان میں اپنا کوئی مرتبہ پیدا کرے۔ چنانچہ اس قانون کی تعبیر کا حق انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جنہوں نے اس خدمت کے لیے پوری طرح ذہنی تیاری کی ہو۔ لیکن فرض کیجیے کہ کل ایک اخبار نویس یا ایک سیاسی لیڈر تعزیرات پاکستان کی

ورق گردانی کرے یا پاکستان کے دستوری قانون کا ترجمہ پڑھ کر، بلکہ یوں کہیے کہ اتنی مشقت بھی اٹھائے بغیر یہ دعویٰ کرے کہ چونکہ قانون کی تعبیر کرنا کسی طبقے کے لیے خاص نہیں، لہٰذا میں ججوں یا وکیلوں، یا قانونی محققین کی پوزیشن میں بات کرنے کا حقدار ہو گیا ہوں۔ اور اگر میرا یہ حق نہیں مانا جاتا تو یہاں لایرکریسی (LAWYERCRACY) قائم ہو گئی ہے تو فرمائیے کہ اس کے ذہنی توازن کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے؟ آپ کہیں گے کہ وہ سر پھرا ہے۔ وہ اگر سر پھرا ہے تو کیا اس شخص کا دماغ صحت مند ہو گا جو یہ چاہے کہ قرآنی حکمت و قانون پر جو نظامِ زندگی چلے اس میں اہلِ علم اور بے علم لوگوں کو یکساں حقِ تعبیر حاصل ہو! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ نہ قانون کے دائرے میں یہ ممکن ہے، نہ رائے عام کے سیاسی دائرے میں!

دینی عناصر کی اہمیت بڑھنے کے اندیشے کا سدِ باب محض لفظ "سنت" کو قلمزن کرنے سے نہیں ہو سکتا، سرے سے اسلام ہی کا اُڑانا پڑے گا۔

تفرقہ کا سبب مفاد پرستی ہوتی ہے غیر صحت مندانہ اختلافات، یا دوسرے لفظوں میں فرقہ وارانہ اور متعصبانہ جھگڑے زندگی کے جس بھی گوشے میں پیدا ہوتے ہیں، ذہنیتوں کے فساد سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بڑے گہرے اسباب ہوتے ہیں جن کا تعلق انفرادی اور اجتماعی نفسیات سے بھی اور معاشرہ کی اخلاقی حالت سے بھی ہے۔ لیکن ان کی اصل جڑ ہمیشہ "بَغْيًا بَيْنَهُمْ" ہوتی ہے۔ قرآن کے ان الفاظ میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے وہ سادہ لفظوں میں یہ ہے کہ جب اجتماعی سرگرمیوں اور تمدنی مسائل میں کسی گروہ کے سامنے سے اصولِ اساسی اور نصب العین حق کی اہمیت ہٹ جاتی ہے اور مفاد بیچ میں آ کودتا ہے، اور اسی طرح علمی و فکری بحثوں میں جب جستجوئے حق کے بجائے گروہی مصلحت اہمیت اختیار کر جاتی ہے تو غیر صحت مندانہ اختلافات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ چاہے کوئی قوم سرے سے اسلام یا کسی اور مذہب کو مانتی اور جانتی بھی نہ ہو تو بھی یہ قانون اس کے اندر ٹھیک اسی طرح اپنا کام کرے گا جیسے وہ آپ کو مسلمانوں کے اندر کام کرتا ملتا ہے۔ اسی طرح کوئی گروہ جو سنت کا قطعی منکر ہو، وہ بھی اس قانون کی زد میں اسی طرح آئے گا جس طرح اپنی قوم کا حال

آپ دیکھتے ہیں - بلکہ دُور کیوں جائیے، ذرا اپنی "واحد نمائندہ" سیاسی جماعت کا حال دیکھ لیجیے، اور پھر بھی اگر تسلی نہ ہو تو پورے کے پورے برسرِ اقتدار طبقے پر نگاہ ڈال کر ایک ایک شخص اور گروپ کے ہفت سالہ دور کا مطالعہ کیجیے۔ تخرّب کی جو عجیب و غریب مثالیں سامنے آئیں گی، سازشی کارروائیوں کے جو عبرتناک نمونے آپ کی نظر سے گذریں گے، جوڑ توڑ کے جو حیرت انگیز شعبدے آپ کے ملاحظہ میں آئیں گے، کرسیوں کے ٹکرانے کے جو شرمناک مناظر تاریخ پاکستان کو منوّر کرتے ملیں گے، یہ سب کچھ سنّت اور سنت پر ایمان رکھنے والوں کی برکات نہیں ہیں، خالص متجددین کے زرّیں کارنامے ہیں۔ ان زرّیں کارناموں نے اس ملک کو آج شخصی آمریت، فوجی ڈکٹیٹرشپ اور لادستوریت کے مہلک خطرات سے دوچار کرکے دنیا بھر میں اس کی ساکھ اجاڑ دی ہے۔ آپ جب ٹھنڈے دل سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہاں بھی وہی الٰہی قانون کام کر رہا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس قانون کا عمل جیسا دین کو ماننے کی صورت میں ہوتا ہے ویسا ہی لادینی کی صورت میں بھی ہوتا ہے، اور اس کا اثر جس طرح سنّت کے دائرے میں پڑ سکتا ہے، ویسا ہی قرآن پر پڑ سکتا ہے۔ شاید آپ کے علم میں ہوگا کہ ہمارے ہاں ایک بڑا فرقہ ایسا پایا جاتا ہے جو سرے سے موجودہ قرآن ہی کو ناقابلِ اعتماد ٹھیراتا ہے اور اس کو محرّف گردانتا ہے۔ "بغیاً بینہم" کی بلا نے اس گروہ کو دوسروں کے ساتھ ایک قرآن پر بھی جمع ہونے کے قابل نہ چھوڑا۔ اصول کے بجائے جب مفاد آگے آجاتا ہے اور ایمان کے بجائے تعصب کام کرنے لگتا ہے تو پھر سنّت تو کیا، لوگ ایک خدا پر بھی متفق نہیں رہ سکتے۔ ہماری تاریخ ہو یا بنی اسرائیل کی، یا دوسری گذشتہ و موجودہ اقوام کی، جسے بھی آپ ملاحظہ فرمائیں گے اس میں یہی "بغی"، یا دوسرے لفظوں میں مفاد پرستی اور تعصب زدگی آپ کو فرقہ بندیاں پیدا کرتی دکھائی دے گی۔ اس "بغی" کے کرشموں کو اٹھا کر "سنت" کے انسٹی ٹیوشن کے سر تھوپ دینا ایک ایسی مضحکہ انگیز حرکت ہے جس پر ہر معقولیت پسند آدمی سر دھنتا رہ جائے گا۔ اگر متجددین کی اندھی منطق اس اسلوب پر کام کرتی ہے تو کچھ بعید نہیں کہ کل آپ یہ ادعا بھی کریں کہ پنجاب اور مشرقی پاکستان کے سیلاب اور کوئٹہ کے زلزلے کا اصل سبب بھی سنّت اور ملّا ازم اور زفرار دادِ مقاصد ہے! اس نو ایجاد

پاکستانی منطق کا توڑ کس کے پاس ہوگا!

اشتراکیت اور ملاازم کا موازنہ "ملا ازم بھی اتنا ہی خطرناک ہو گیا جتنا کہ اشتراکیت تھی"!

کیا آپ نے یہ لکھتے ہوئے سوچا بھی کہ اشتراکیت کیوں خطرناک ہے اور پاکستان کا مسلمان اسے کیوں اپنے حق میں ایک تباہ کن مصیبت سمجھتا ہے؟ یہ جملہ یہی غمازی کرتا ہے کہ غور و فکر سے کام نہیں لیا گیا۔ اگر ناگوار نہ ہو تو ہم عرض کر دیں۔

پہلی چیز جس کی وجہ سے پاکستان کا فاقہ کش دہقان اور مظلوم مزدور اشتراکیت کے ہاتھ سے روٹی لے کر کھانے سے بچنا چاہتا ہے یہ ہے کہ اس روٹی کی قیمت میں اسے اپنا دین و ایمان، اپنی ملی روایات، اپنی تاریخ، اپنا کلچر سب کچھ دینا پڑتا ہے۔ ہمارے غریب طبقے مادہ پرستی کے اُس زہر سے بچنے کے لیے فاقہ کشی کے استبداد اور سرمایہ دار طبقے کے مظالم سے صبر و تحمل کے ساتھ گذر رہے ہیں جو اشتراکی فلسفے کے تنور میں پکی ہوئی روٹی میں ملا ہوا ہے۔ وہی قرآن و حدیث کہ جن کے خلاف آپ حضرات پیچ و تاب دکھا رہے ہیں، ان غریب طبقوں کا سرمایۂ ایمان ہیں اور وہی کتاب و سنت کے الفاظ جن سے آپ کو چڑ ہے، آپ کے ہزاروں بھائیوں کے لیے ایک انمول خزانۂ تسکین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عمل کی دنیا میں تو آپ نے ان کو ایک تنکا بھی نہیں دیا، کاغذی دنیا میں آپ نے ان کی جھولی میں ابھی صرف یہ دو لفظ ہی ڈالے تھے، لیکن اس داد و دہش پر بھی آپ کو اب پشیمانی ہو رہی ہے اور یہ الفاظ بھی واپس چھیننے کے درپے ہیں۔ لیکن غلط فہمی نہ ہو، یہ آپ کی داد و دہش نہیں، یہ قوم کی روح کی اپنی پکار ہے جس کی گونج قرار دادِ مقاصد میں سنائی دے رہی ہے اور اس گونج کو اب کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ کیا سنت کا علمبردار ملاازم بھی اشتراکیت کی طرح ان کو مادہ پرستی اور الحاد کے جہنم میں جھونکنا چاہتا ہے کہ آپ نے دونوں کی خطرناکی میں مشابہت پیدا کر دی؟ بخلاف اس کے سنت سے لگاؤ رکھنے والوں کا گروہ ایک ایسا گروہ ہے جو ہمارے عوام کا معاشی مسئلہ تو حل کر کے نہیں دیتا، البتہ مفت میں مادہ پرستی اور الحاد کے جہنم میں جھونک دینے پر تُلا ہوا ہے۔

دوسری چیز جو ہمارے عوام کو اشتراکیت سے متنفر کرتی ہے وہ ہماری پالیسی پر باہر کے ایک ملک

کے اثر انداز ہونے کا واضح خطرہ ہے۔ اشتراکیت جہاں پر تو ڈالتی ہے وہاں ایک طرف اس دین معاشی کی ارض مقدس اور اس کے قبلہ و کعبہ کا ذہنی تسلط قائم ہو جاتا ہے اور وہ فکری لحاظ سے چشمۂ ہدایت قرار پاتا ہے، دوسری طرف ملکی اور بین الاقوامی پالیسی کی باگ ڈور ایک بیرونی طاقت کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔ فرید جعفری صاحب ذرا ارشاد فرمائیں کہ کیا ملا ازم بھی پاکستان کے عوام کو کسی خارجی طاقت کے ذہنی اور سیاسی تسلط میں دینا چاہتا ہے؟ ــــ اس کا جواب وہ اثبات میں جبھی دے سکتے ہیں کہ وہ خدا اور رسول کو بھی ایک خارجی طاقت (FOREIGN-POWER) قرار دیں! ناگوارِ خاطر نہ ہو تو ہماری ناقص رائے یہ ہے کہ بدنام روزگار "ملا ازم" کی کوششوں کے خلاف یہ متجددین ہی ہیں جو پاکستان کو ذہنی لحاظ سے بیرونی طاقتوں کے قدموں میں ڈال دینا چاہتے ہیں اور سیاسی و معاشی حیثیت سے اسے کسی نہ کسی کے گھڑے کی مچھلی بنا کے رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ مماثلت بھی اشتراکی خطرے سے اگر ہو سکتی ہے تو مخالفِ دین حضرات کی روش میں ہو سکتی ہے۔ اس طرح کا اندیشہ ملا ازم سے کیسے وابستہ کیا جا سکتا ہے!

تیسری چیز جو اہلِ پاکستان کو اشتراکیت سے دُور ہٹانے والی ہے وہ اس کی انقلابی تکنیک ہے۔ اشتراکیت تبدیلی پیدا کرنے کے لیے غیر ملکی ساز باز کے ساتھ ساتھ توڑ پھوڑ کا جو مہلک طوفان برپا کرنے پر فطرتاً مجبور ہے، پاکستان کے لوگ اپنی نوخیز مملکت اور اپنی ملی ہیئت کو اس کی موجوں کا شکار ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ پاکستان کے دینی عناصر سے اس انقلابی تکنیک کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ وہ نہ غیر ملکی ساز باز کا مزاج رکھتے ہیں، نہ سازشی اسلوب ان کو اپیل کر سکتا ہے، نہ خفیہ طرزِ تحریک اُن کے دینی رجحانات سے میل رکھتا ہے اور نہ غیر آئینی توڑ پھوڑ کو ان کے ذوق سے مناسبت ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکے کہ پھر "ملا ازم" کو اشتراکیت جیسا خطرہ کس بنا پر کہا گیا ہے۔ البتہ اس لحاظ سے بھی ملک کو مارشل لاء اور فوجی حکومت اور ۹۲ الف اور آمریت کے مصائب میں مبتلا کر کے متجددین ہی ایک ایسا خطرہ ثابت ہو رہے ہیں جن کو کسی نہ کسی درجے میں اشتراکی خطرے کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔

آخر میں ایک پہلو اور رہ جاتا ہے جس کا جائزہ ہمیں لینا چاہیے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ موجودہ برسرِ اقتدار

اصحاب کا گروہ اشتراکیت کو غالباً اس لحاظ سے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا ہو کہ یہ بلا اگر آوارد ہو تو یہ ان کی مسندوں کو ضرور تنزلزل کر ڈالے گی پھی وہ پہلو ہے جس کے زاویہ سے یہ گروہ جب دینی عناصر کی اٹھان کو دیکھتا ہے تو ادھر بھی اسے وہی خطرہ دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ اشتراکیت کے خونی ہاتھ کے مقابلے میں اسلامی تحریک کا ہاتھ امن و سلامتی کا ہاتھ ہے، اشتراکی دعوتِ انقلاب کے مقابلے میں اسلامی دعوت، اصلاح کی دعوت ہے، طبقاتی کشمکش کے بگل کے مقابلے میں یہ صرف اصولوں کی کشمکش کی نفیر ہے، فوری ادل بدل کے مطالبے کے مقابلے میں یہ تدریجی تغیّر کا تقاضا ہے، دشمنی کے جذبے کے بجائے ادھر برادرانہ خیر خواہی کا داعیہ کار فرما ہے۔ لیکن اگر اصلاح پسندانہ تدریجی تغیر بھی ناگوار گذرے تو پھر ہر طرف خطرہ ہی خطرہ نظر آئے گا۔ اس خطرے سے نجات تو اسی صورت میں ممکن ہو گی جبکہ تاریخ کے چلتے ہوئے کاروانِ حوادث کو موجودہ حالت کے کھونٹے سے باندھ کے کھڑا کیا جا سکے۔

اب دیکھ لیجیے کہ "ملاازم" کو اشتراکیت کے مماثل ایک خطرہ قرار دیتے ہوئے فرید جعفری صاحب نے کہاں تک غور و تفکر سے کام لیا ہو گا! ہو سکتا ہے کہ انہوں نے امریکہ کی اشتراکیت دشمنی کا رُخ پاکـــ کے دینی رجحانات کی طرف موڑ دینے کے لیے یہ فقرہ لکھ ڈالا ہو اور ایسے کام میں دلائل کی ضرورت ہی نہ سمجھی ہو۔

بہتّر سے زائد فرقے | فرید جعفری صاحب کی تازہ ریسرچ اور جدید ترین انکشاف یہ ہے کہ پاکستان میں بہتّر سے زائد فرقے پائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی اُن سے مطالبہ کرے کہ براہ کرم ان بہتّر سے زائد فرقوں کی فہرست نمبروار اپنے اخبار میں شائع فرما دیجیے تو وہ یہ فہرست کہاں سے پوری کر کے دیں گے۔ بہتّر سے زائد تو خیر بڑی بات ہے، ہم درخواست کریں گے کہ صرف دس ہی فرقوں کے نام شائع فرما دیجیے جو پاکستان کی اجتماعی ہیئت کے بارے میں سنّت کی مختلف تعبیرات ساتھ لیے میدانِ عمل میں نمایاں ہوں: بجز اس کے کہ وہ ہر اختلاف کو ایک نئے فرقے کی اساس مان کر اکّے دکّے افراد اور ناقابلِ ذکر ٹولیوں کی گنتی گن ڈالیں، ——— جیسے کہ وہ اپنے آپ کو ایک فرقہ قرار دے لیں ——— اور کسی صورت وہ دس فرقوں کی تعداد بھی پوری نہیں کر سکتے۔ بڑے بڑے فرقے جن میں بنیادی اختلافات موجود ہیں

دو ہی ہیں :- ایک اہل سنت والجماعت ، دوسرے شیعہ حضرات ! ان کے اندر جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ محض مدارس فکر کے اختلافات ہیں جن کی وجہ سے مستقل فرقے نہیں پیدا ہوتے - اس تعداد کو پیش کرنے کے لیے بڑے سے بڑے مبالغہ سے بھی کام لیا جائے تو بھی اس میں ستر کا اضافہ کردینا بہت بڑی شاعری ہے -

لیکن یہ دو یا بہتر سے زائد فرقے جن کے اختلافات کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر آپ سنت کو بدنام کرنا چاہتے ہیں ان کی اتحاد پسندی اور معقولیت کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے صدیوں کے اختلافات کو تہ کرکے جنوری ۱۹۵۱ء میں بمقام کراچی جمع ہو کر دو تین روز کے تبادلۂ خیالات سے ایک ہی تعبیر سنت پر اتفاق کرلیا تھا اور پاکستان کی اجتماعی ہیئت کے متعلق ۲۲ متفقہ اصول طے کرکے منتشر ہو گئے - آپ کے متجددین سیٹوں کے بٹوارے پر ایک مرتبہ لڑے ، دوسری مرتبہ لڑے ، پھر تیسری مرتبہ "ایک یونٹ" کے مسئلے پر باہم دگر روٹھ کر منتشر ہو گئے اور ان کی باہمی پھوٹ کی وجہ سے مسودۂ دستور تو کیا خود دستوریہ کا وجود خطرے میں پڑ گیا - اور ملک ایک عجیب ہنگامی صورت سے دوچار ہو گیا - آخر آپ ارشاد تو فرمائیے ، کس دستوری نکتے پر ، کس سیاسی مسئلے پر اور کس ملکی قضیے پر آپ نے قرآن و سنت کی مختلف تعبیرات کرنے والے بہتر فرقوں کو لڑتے دیکھا ہے - کسی کے خلاف الزام عاید کرنے سے قبل ضروری معلوماتی مواد تو فراہم کرلینا چاہیے تھا اور پہلے اپنی جگہ اس کا جائزہ لے لینا چاہیے تھا -

سنت اور جمہوریت | سنت کے انسٹی ٹیوشن کے خلاف آپ کا ایک الزام یہ ہے کہ اس نے اسلام کے ابتدائی جمہوری نظام میں بگاڑ پیدا کیا - اس تحقیق انیق کا سرچشمہ کیا ہے ؟ اس کے لیے آپ نے کیا تاریخی مواد اور کیا استدلالی مسالہ جمع کیا ہے ؟ افسوس ہے آپ نے پوری عبارت میں اس طرح کا جو دعویٰ بھی کیا ہے اس پر دلیل کہیں ایک بھی پیش نہیں کی -

یہ بات علمی اور تاریخی حیثیت سے ثابت شدہ ہے اور اس کی تردید کرنے کی جسارت کوئی نہیں کرسکتا کہ خلفائے راشدین نے اجتماعی نظام کو قرآن کے ساتھ ساتھ سنت کی بنیاد پر چلایا ہے - اس کے ساتھ یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ خلافت راشدہ کے پورے دور میں اسلامی جمہوریت کے تمام لوازم ، مثلاً

آزادیٔ رائے، حقِ تنقید، رائے عام کا احترام، عدلیہ کی آزادی اور شورائیت پوری طرح کارفرما رہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی جمہوریت اگر شخصی بادشاہت میں بدلی ہے تو بنو امیہ کے ان سلاطین کے ہاتھوں بدلی ہے جنہوں نے نہ صرف سنت سے، بلکہ خود قرآن سے انحراف کیا۔ موروثی اقتدار کا کوئی تصور نہ سنتِ نبوی میں ملتا ہے، نہ سنتِ خلفائے راشدین میں۔ رسول اللہ صلعم جب واصل بحق ہوئے تو اپنے کسی بیٹے بھتیجے کو گدی نہیں سونپی، بلکہ امت میں جو ہستی (FIGURE) نمایاں ترین مرتبہ رکھتی تھی اسے لوگوں نے منتخب کر لیا۔ پھر خلیفۂ اول کا دمِ آخر آپہنچا تو شورائیت کے اصول پر اہل الرائے سے مشورہ کر کے آپ نے اپنے بیٹے اور دوسرے عزیزوں کو چھوڑ کر ایک ایسے بہترین رفیقِ مقصد کو نامزد فرمایا جسے رائے عام نے پسندیدگی کے ساتھ قبول کیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے دنیا پر نگاہِ واپسیں ڈالتے وقت اپنے بیٹے کو نامزد کرنے کے بجائے ایک خاص کمیٹی اپنے جانشین کے تقرر کے لیے مامور کی۔ اس نے رائے عام کو اتنا کھنگال کر حضرت عثمانؓ کا تقرر کیا کہ اُس دور کے لحاظ سے ہم اسے اچھا خاصا انتخاب قرار دے سکتے ہیں۔ سب سے آخر میں حضرت علیؓ کا انتخاب اگرچہ ہنگامی حالات کے آثار چڑھاؤ میں ہونے کی وجہ سے ایک مختلف نوعیت رکھتا ہے، لیکن بہرحال موروثی اقتدار کے نظریے کے بجائے امت کے عمومی اقتدار کے نظریے ہی کے تحت ہوا۔ یہ تھی سنتِ نبوی اور سنتِ خلفائے راشدین! اس دور کے مقابلے میں امویوں اور عباسیوں اور فاطمیوں کے دور جہاں بھی اسلامی جمہوریت و شورائیت سے ہٹتے ہوئے ملتے ہیں وہاں قصور سنت کا نہیں، نتیجہ ترکِ سنت کا ہے! بادشاہوں کا اپنے بیٹوں کو ولی عہد بنانا، جانشینوں کو نامزد کرنا، ان کے لیے پیشگی بیعت لینا، پھر ہر تخت نشین ہونے والے کا اپنے لیے جبری بیعت حاصل کرنا یہ سارے کے سارے مفاسد سنت کا دامن چھوڑ دینے کے بعد ہی اسلامی معاشرے میں پیدا ہوئے۔ ان مفاسد کے مقابلے میں صدائے حق بلند کر کے سولیوں پر چڑھنے والے، تلواروں سے ذبح ہونے والے اور کوڑے کھانے والے ائمہ و صلحاء البتہ وہ لوگ تھے جن کو آج تک حاملینِ سنت کہا جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس دیدہ دلیری سے تاریخ کی ترتیب دن دہاڑے اُلٹ کر ہمارے سامنے

رکھی جاتی ہے۔ جو کرتوت تارکینِ سنت کے تھے اور جمہوریت کو ذبح کرنے کا جو قصور سنت سے روگردانی کرنے والوں کا تھا اس کو اٹھا کر سنت اور حاملینِ سنت کے ذمے لگا دیا جاتا ہے۔ شاید شانِ تجدد یہی ہے کہ جو بات بھی کی جائے لاجواب کی جائے۔

ہاں! اگر منشا یہ ہو کہ سنت قوم کی آزادہ روی میں رکاوٹ ڈالنے کا موجب بنتی رہی ہے، اور فرامینِ نبوت نے جمہور کی خواہشات اور میلانات کو کھل کھیلنے نہیں دیا تو یہ خطا تنہا سنت ہی کی نہیں ہے، اس معاملے میں قرآن نے بھی بہت کچھ کیا ہے اور کر رہا ہے۔ اگر سنت کی یہ حیثیت تھی کہ اسے پیش کر کے ایک زیرِ بحث معاملے کو کسی متعین فیصلے تک پہنچایا جا سکتا تھا تو قرآن کی آیات میں یہ اتھارٹی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اگر سنت اس معنی میں جمہوریت کی نقیض تھی تو قرآن اس سے کئی گنا زیادہ نقیض ہے، کیونکہ سنت میں قیل و قال کی گنجائش قرآن کے مقابلے میں بہر حال زیادہ موجود ہے۔ اب اگر مطلوب ایسی غیر محدود جمہوریت ہو جس میں آپ کے عوام اور آپ کی پارلیمنٹیں اور وزارتیں اندھا دھند جدھر چاہیں بڑھتی چلی جائیں تو پھر محض سنت سے لڑائی لڑ کے آپ نجات نہیں پا سکتے، خود قرآن کے خلاف بھی ہلّہ بولنا پڑے گا۔

الٹا نظریہ سنت کے انسٹی ٹیوشن پر ایک الزام یہ بھی لگایا گیا ہے کہ اس نے ملت کو پارہ پارہ کر دیا۔ مگر یہ عجیب و غریب الزام امرِ واقعہ کے بالکل برعکس پڑتا ہے۔ قرآن کو اگر سنت سے الگ کر کے لیا جائے تو اس کے اصولی احکام کی تعبیرات میں اختلاف کرنے کا میدان غیر محدود حد تک وسیع رہتا ہے۔ بخلاف اس کے سنت کا انسٹی ٹیوشن تعبیرات و تاویلات کی جولانگاہ کے حدود اربعہ معین کرتا ہے اور فکر و تدبر کو ایک سیدھی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ مثلاً قرآن سے اگر مجرد یہ حکم لے لیا جائے کہ نماز پڑھو اور سنت سے اس کی ہیئت و ترتیب اور اس کے کلمات و حرکات اور اس کے اوقات و آداب کو حاصل نہ کیا جائے تو کوئی دو شخص بھی نماز کے مقصد، اس کی ہیئت، اس کے کلمات، اس کے اوقات اور اس کے آداب و شرائط پر متفق نہیں ہو سکتے۔ یا مثلاً اگر حلت و حرمتِ ماکولات کا ضابطہ قرآن سے لیتے ہوئے اس کی تفصیل نبی صلعم سے نہ لی جائے تو بے شمار جانداروں کی حلت و

حُرمت میں فرد فرد کا زاویۂ نظر مختلف ہوگا، یہاں تک کہ گنتی تک کے بارے میں کوئی متفقہ رائے اختیار نہیں کی جاسکتی۔ یہی حال وراثت، نکاح و طلاق، قانونِ صلح و جنگ اور لین دین کے معاملات کا ہے۔ سنت کو اختیار کرنے سے انسانی فکر کی اختلاف پسند فطرت کو اتنی جولانگاہ بھی مل جاتی ہے کہ وہ مختلف حالات میں کوئی موزوں اجتہادی مسلک اختیار کر سکے، اور دوسری طرف یہ فطرت اتنا کُھل کھیل بھی نہیں سکتی کہ سرے سے اتحاد و اشتراک کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں۔ سنّت ہمارے فکر و نظام کو استقلال (STABILITY) دیتی ہے۔ یہی مشعل ہے جو قرآن کی ممکن تاویلات و تعبیرات کے ہجوم میں سے ہمارے سامنے صحیح راہِ فکر واضح کرتی ہے۔ اگر قرآن کے ساتھ نبی صلعم کی مستند توضیحات پیغمبرانہ اتھارٹی کے ساتھ موجود نہ ہوتیں اور آنحضورؐ کی پوری زندگی اس کے احکام اور تقاضوں کو متعین مفہوم دینے کے لیے ہمارے سامنے نور افشاں نہ ہوتی تو قرآن کے عقائد و احکام میں وہ لاینحل اختلافات برپا ہوتے جو بہتّر فرقے تو کیا، بہتر ہزار امتیں برپا کر دیتے، بلکہ شاید ہر فرد اپنی جگہ ایک مستقل امت اور ملّت ہوتا۔ یہ سنت ہی کا فیضان تھا کہ اہلِ سنت والجماعت میں جو علمی اختلافات واقع ہوئے انہوں نے صرف کلامی اور فقہی مدارسِ فکر پیدا کیے جن میں ہر ایک دوسرے مدارسِ فکر کو اسی طرح برسرِحق سمجھتا ہے جس طرح اپنے آپ کو۔ سنّت نے ان کے باہمی اختلافاتِ فکر و تدبر کو بنیادی اصولوں اور قرآن کے جامع مفہومات میں کبھی متفرق نہیں ہونے دیا۔ دوسری طرف جن لوگوں نے بنیادی اصولوں اور قرآن کے جامع مفہومات میں گڑبڑ اور تفرقہ پیدا کیا، انہوں نے سنت کی مشعل یا تو گُل کر دی، یا اسے کسی اعتقادی فتنے کی اوٹ میں چھپا دیا۔ مثلاً خوارج اپنے فاسد نظریات کو لے کر اُٹھے تو انہیں "حسبنا کتاب اللہ" کا نعرہ نہایت درجہ غلط مفہوم کے ساتھ بلند کرنا پڑا۔ یا مثلاً شیعہ حضرات نے قرآن کی آیات میں تصرف کرنا چاہا تو اس پر سے سنت کا پہرہ اٹھانے کے لیے سنت کا ایک جعلی ریکارڈ پیدا کیا۔ بعض بگڑے ہوئے اہلِ تصوف قرآن کے الفاظ کے باطن در باطن سے عجیب عجیب و غریب نکات پیدا کرنے کے درپے ہوئے تو انہوں نے ولایت کو نبوت سے افضل قرار دے کر وحی کے مقابلے میں کشف کا دروازہ کھول لیا۔ اور اس طرح سنتِ نبوی

کی اتھارٹی کو کمزور کر دیا۔ پس درحقیقت سنت قرآن کی حقیقتوں اور تقاضوں اور احکام کی محافظ اور اس کے مفہومات پر امت کو جمع کرنے والی ہے اور اسے پراگندگی سے بچانے والی ہے۔ اس کے بارے میں ہمارے ایک اخبار نویس کا نظریہ بالکل اُلٹا ہے اور اس اُلٹے نظریے پر رتی بھر استدلال نہیں کیا گیا۔

سنت کا پارٹ ہماری تاریخ میں

سنت پر تفرقہ انگیزی کی تہمت باندھنے کے بعد پونے چودہ صدیوں کی تاریخ میں واقع ہونے والے سارے تفرقوں اور باہم آویزیوں کی ذمہ داری بھی اسی انسٹی ٹیوشن کے سر ڈال دی گئی ہے۔ امویوں، عباسیوں، فاطمیوں اور عثمانیوں کے دور میں جہاں کہیں کوئی غیر صحتمندانہ اختلافات پائے جا سکتے ہیں، فرید جعفری صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ (نعوذ باللہ) یہ سب شرارت سنت کی ہے۔ اتنا بڑا دعویٰ کس طنطنے سے کر دیا گیا ہے، لیکن اتنی لمبی چوڑی تاریخ میں سے دو چار واقعات بھی تعین کے ساتھ شہادت میں پیش نہیں کیے گئے۔ دلیل کے افلاس کی تو یہ حد ہے۔ فرض یہ کر لیا گیا ہے کہ "پاکستان اسٹینڈرڈ" کے دفتر کے باہر احمقوں کی ایک ایسی دنیا آباد ہے جو اس دفتر سے نشر ہونے والی ہر لغو سے لغویات پر آمنّا وصدّقنا کہنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ لیکن نہیں، دراصل جعفری صاحب جس خاص گروہ سے داد لینا چاہتے ہیں اس کے بارے میں ان کا گمان یہ ہے کہ وہ چونکہ دینی عناصر کے خلاف پہلے سے کد رکھتا ہے لہٰذا اس کے سامنے جو کچھ بھی الاپ دیا جائے گا اس پر کسی دلیل اور کسی شہادت کی سرے سے ضرورت نہیں ہے، وہ گروہ بے دھڑک مرحبا اور آفرین کے نعرے بلند کر دے گا۔ ایسے جذباتی لوگوں میں الگ بیٹھ کر آپ ان کی تسکینِ ذوق کے لیے جو چاہیں کرتے رہیں، لیکن برسرِ عام سنتِ رسولؐ پر بھرپور حملہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے کہ اس پر کوئی محاسبہ کرنے والا نہ ہو۔ آپ نے اپنے دعویٰ کے حق میں تاریخ سے کوئی واقعاتی شہادت پیش نہیں کی، لیکن ہم آپ کے سامنے اس دعویٰ کی تردید میں واقعاتی شہادت پیش کرتے ہیں۔ ان چند مثالوں کو دیکھ کر آپ از سرِ نو غور کریں کہ کیا ایسے بے سروپا دعویٰ کو کھڑا کرنے کے لیے آپ کو کہیں زمین مل سکتی ہے!

مثال (۱) آنحضور صلعم کی وفات پر پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے جسدِ مبارک کو کس مقام پر دفن کیا جائے۔ ذہن مضطرب ہیں، قرآن اس معاملے میں نہیں بولتا۔ یکایک ایک قولِ نبیؐ سامنے آجاتا ہے کہ نبی وہیں دفن ہوتا ہے جہاں اس کی وفات ہو۔ اس پر سارا اضطراب ختم ہو جاتا ہے اور امت ایک متفقہ فیصلے پر پہنچ جاتی ہے۔ آپ کا مدفن حجرۂ عائشہ صدیقہؓ ہی قرار پاتا ہے۔

مثال (۲) — آپ کے ترکہ کی تقسیم کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے جو بڑے جھگڑوں کا مسئلہ تھا لیکن جب یہ ارشادِ نبوت سامنے آجاتا ہے کہ ہم انبیاء جائدادیں اور وراثتیں نہیں چھوڑا کرتے، ہمارا جو کچھ ہے وہ وقف[۱] العام ہے۔ تو قضیہ فیصل ہو جاتا ہے۔

مثال (۳) — سقیفہ بنو ساعدہ کی مجلسِ اعیان میں رسول اللہؐ کے جانشین کی نامزدگی کے لیے سخت تند و تیز بحث چل پڑی۔

سعد بن عبادہ نے انصار سے کہا کہ فاستبدوا بھذا الامر دون الناس، فانہ لکم دون الناس یعنی آگے بڑھو اور زمامِ کار ہاتھ میں لے لو، تم ہی سب سے زیادہ حقدار ہو۔ متعدد لوگوں نے اس کی تائید کی۔

ایک آواز: "اگر اہلِ قریش نے نہ مانا تو کیا صورت ہو گی!"

دوسری آواز: "تو پھر ہم کہیں گے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو گا اور ایک امیر تم میں سے"

سعد بن عبادہ: "یہ کمزوری کا ظہورِ اوّل ہے"

۱۔ آنحضور صلعم نے ارضِ خیبر اور باغِ فدک سے متعین مقاصد کے لیے زندگی میں جو استفادہ فرمایا تھا وہ بطور سربراہِ ریاست (HEAD OF THE STATE) تھا۔ اسکی نوعیت ذاتی اور نجی ملک کی نہیں تھی۔ لہٰذا اس ارشاد کی روشنی میں یہ زمینیں ریاست کی طرف منتقل ہو گئیں۔ اس بارے میں حضرت فاطمہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا کچھ مدت تک اطمینان نہیں ہوا، لیکن بہ حیثیت مجموعی صحابہ کی جمہوری سوسائٹی نے ان زمینوں کے تصرف کی صحیح پوزیشن کو سمجھ لیا اور خلیفہ کے شورائی فیصلہ کو تسلیم کر لیا۔ بعد میں شیعہ حضرات نے معاملہ کو اصل واقعہ سے بہت بڑھا چڑھا کر ایک مستقل نزاع بنا دیا۔

یہ بحث چل رہی تھی کہ امت کے تین بڑے لیڈر حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضوان اللہ علیہم اجمعین مجلس میں داخل ہوئے۔ حضرت عمرؓ تندی سے کچھ کہنے لگے تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کو روک دیا اور نہایت ٹھنڈے انداز سے تقریر فرمائی۔ اس تقریر میں پہلے مہاجرین و انصار دونوں کی خدمات کا ذکر کیا، پھر مہاجرین کی علمی اور عملی افضلیت کو بیان کیا جس کا مذکور خود قرآن مجید میں ہے۔ لیکن بحث بہتر رخ پر پڑ جانے کے باوجود کسی فیصلے پر منتج نہ ہوسکی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک ارشادِ نبوت کی طرف توجہ لائی کہ "الائمۃ من قریش" اور اس کی توضیح فرماتے ہوئے کہا کہ "فاما العرب فلن تعرف ھذا الامر الا لھذا الحی من قریش" (ابوبکر: محمد حسین ہیکل ص ۶۲) یعنی عرب سوائے قریش کے اور کسی کے اقتدار پر راضی نہیں ہوسکتا۔ پس بہترین فارمولا یہی ہوسکتا ہے کہ "منّا الامراء و منکم الوزراء"۔ اس پر تھوڑی سی گفتگو ہونے کے بعد اتفاق رائے پیدا ہوگیا۔ دیکھیے سنت (یا حدیث) نے کس طرح حالتِ انتشار کو اتفاق واجتماع میں بدل دیا۔

مثال (۴) ——— خلیفۂ اول کے دور میں سب سے پہلا مسئلہ جو مجلسِ شوریٰ میں پیش ہوا جیشِ اُسامہ کی ترسیل کا تھا۔ رومیوں کے خلاف جنگِ موتہ (۸ھ) کے نتائج کو دیکھ کر نبی صلعم نے مرض الموت سے کچھ قبل یہ لشکر حضرت اُسامہ کی سرداری میں مرتب کیا تھا، مگر عین اس کے کوچ کے وقت آپ مرض الموت میں مبتلا ہوگئے۔ اس لیے معاملہ ملتوی ہوگیا۔ خلافتِ صدیقی کے انعقاد پر یہ مسئلہ از سرِ نو سامنے آگیا۔ اہلِ شوریٰ اس لشکر کی ترسیل کے خلاف تھے، کیونکہ رسول اللہ کی وفات اور مرتدین، مدعیانِ نبوت اور مانعینِ زکوٰۃ کے داخلی فتنوں نے جو ابتری کی کیفیت پیدا کردی تھی اس میں ایک بہت بڑی بیرونی طاقت کے

لہ یہ ارشادِ نبوی حکمِ شرعی کے بجائے ایک امرِ واقعی کی تصریح کی نوعیت رکھتا ہے۔ رسول اللہ صلعم جہاں ایک طرف انتہائی اصول پسند تھے اور اس اصول پسندی کے تحت فرمایا تھا کہ اگر نکٹا حبشی غلام بھی امارت پر مامور ہوجائے تو اس کی بے چون و چرا اطاعت کرنا عین تقاضائے دین ہے۔ وہاں ایک عملی رہنما کی حیثیت سے امرِ واقعی کو بھی پوری اہمیت دی کہ عرب میں قریش کے علاوہ اور کسی کا اقتدار چلنے کا نہیں۔ آپ اصول پسند تھے مگر خیالیت پسند (UTOPIAN) نہیں تھے۔

خلاف لشکرکشی کرنا ان کی نگاہ میں خطرناک اقدام تھا۔ اس بحث و تمحیص کا خاتمہ حضرت ابوبکرؓ کے ان عزیمت مندانہ الفاظ پر ہوتا ہے کہ "والذی نفس ابی بکر بیدہ، لو ظننت ان السباع تخطفنی لانفذت بعث اسامۃ کما امر بہ رسول اللہ صلعم، ولو لم یبق فی القری غیری لانفذتہ[1] (ابوبکر: محمد حسین ہیکل ص ۹۶) یعنی اگر مجھے یہ اندیشہ ہو کہ اس کارروائی پر مجھے درندے پھاڑ کھائیں گے، یا یہ کہ میرے سوا ان بستیوں میں کوئی باقی نہ رہے گا تو بھی اُسامہ کو رسول اللہ صلعم کے فیصلے کے بموجب ضرور روانہ کروں گا"۔

کچھ اور قیل و قال ہوئی تو پھر مزید حزم و جزم سے فرمایا کہ "لو خطفتنی الکلاب والذئاب لم ارد قضاءً قضٰی بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابوبکر: محمد حسین ہیکل ص ۹۶-۹۷) " یعنی اگر مجھے کتے اور بھیڑیے بھی اُچک لے جائیں تو بھی میں رسول اللہ کے اس حکم کو نہیں بدل سکتا جس کا آپ نے فیصلہ فرمایا ہے۔ اس پر بحث ختم ہو گئی۔

مثال (۵) —— اسی جیشِ اُسامہ کے سلسلے میں انصار نے حضرت عمرؓ کی معرفت خلیفۂ اول کی خدمت میں کہلوایا کہ آپ اگر لشکر کو بھیجتے ہی ہیں تو کم سے کم اس کا سردار تو کسی تجربہ کار اور پختہ سال شخص کو مقرر کیجیے یہ سن کر خلیفۂ اوّل نے حضرت عمرؓ کی ڈاڑھی پر ہاتھ رکھ کر تیز لہجے میں کہا کہ " استعملہ رسول اللہ صلعم وتأمرنی ان انزعہ" (ابوبکر، محمد حسین ہیکل ص ۹۷) یعنی اُسامہ کو رسول اللہ صلعم مامور فرما گئے اور اب تم مجھے یہ مشورہ دیتے ہو کہ میں اسے ہٹا دوں؟ - اس حوالے پر بات معاً ختم ہو گئی۔ پھر لشکر کی ترسیل کے موقع پر جو تقریر کی اس میں پھر پوزیشن کو واضح کرنے کے لیے یہ فرمایا کہ " وانما انا متبعٌ ولست بمبتدعٍ (ایضاً ص ۹۷) یعنی میں آنحضور صلعم کی پیروی کرنے والا ہوں، مبتدع (یا جدید الفاظ میں تجدد پسند) نہیں ہوں[2]"۔

---

[1] یہ تسلیم کہ جیشِ اُسامہ کی ترسیل کا معاملہ ایک انتظامی حکم کے تحت تھا اور انتظامی حکم میں التوا اور ردّ و بدل دونوں ممکن تھے، لیکن صحابۂ کرام کے ذہن کی ساخت تربیتِ نبوی سے بنی ہی ایسی تھی کہ آپؐ کے ارشادات سے روگردانی کی جسارت کسی میں نہ تھی۔ کجا کہ معاملہ شرعی احکام کا ہو۔

[2] مزید الفاظ یہ ہیں: "انی واللہ ما ادع امراً رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصنعہ الا صنعتہٗ"

پالیسی کے اس اصولی ڈیکلریشن کے بعد کلی اطمینان پیدا ہوگیا۔

مثال (۶)، — مانعین زکوٰۃ کے فتنہ کو فرو کرنے کی اسکیم زیر بحث آئی تو حضرت عمرؓ نے کچھ تو نظریاتی وجوہ سے اور کچھ مصالح سیاسیہ کے تحت یہ رائے دی کہ ان سے قتال نہ کیا جائے۔ نظریاتی لحاظ سے تو خلیفۂ اول نے دوسرا جواب دیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مصالح کے بالمقابل یہ فرمایا کہ خدا کی قسم اگر یہ لوگ اس زکوٰۃ میں سے ایک رسی بھی روک رکھیں گے جو رسول اللہ صلعم کو دیا کرتے تھے تو میں ان کے خلاف جنگ کروں گا۔ یعنی جن اموال میں جس شرح سے رسول اللہ صلعم نے زکوٰۃ اخذ فرمائی ہے اس میں اب کوئی ردّ و بدل نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر کوئی سنت سے انحراف کر کے نظام اسلامی سے سرکشی کرے گا تو اس کی اصلاح تلوار سے کی جائے گی۔

یہ چند مثالیں صرف ایک خلیفۂ راشد کے بالکل ابتدائی دور سے ماخوذ ہیں۔ مزید کاوش سے صدہا صد واقعاتی شواہد پیش کیے جاسکتے ہیں جو سنت کے جامع امت ہونے پر دال ہیں۔ خلافت راشدہ تو خیر ایک نورانی دور تھا، بعد میں بھی جہاں کہیں کسی عالم انتشار میں سنت نمودار ہوگئی، سارا طوفان تھم گیا۔ اس کی ایک مثال سیرت امام احمد بن حنبل (ملاحظہ ہو: ایشیا، لاہور، جلد ۴ شمارہ ۸) میں سامنے آتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مسئلہ "خلق قرآن" ایک ایسا فتنہ بن کر نمودار ہوا جس نے اسلامی سوسائٹی کو سخت درجے کے ذہنی انتشار میں ڈال دیا اور کتنے ہی علمائے حق اس سلسلے میں مظالم کا شکار ہوگئے۔ واثق کے دربار میں ایک بزرگ تشریف لائے تو احمد بن داؤد نے ان بزرگ کو بھی درباری نظریے کی دعوت دی۔ ان بزرگ نے اس کے جواب میں کہا کہ جس بات کی طرف دعوت نہ رسول اللہ صلعم نے دی، نہ حضرت ابوبکر اور باقی خلفائے راشدین نے، تم لوگوں کو اس کی طرف کیوں بلاتے ہو۔ اب تم رسول اللہ اور صحابہ کے بارے میں یا تو یہ کہہ سکتے ہو کہ وہ اس مسئلے سے بے خبر تھے، یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس پہ سکوت اختیار کیا۔ اگر ان کو اس کا علم نہ تھا تو تم کو کہاں سے حاصل ہوگیا اور اگر انہوں نے علم کے باوجود سکوت اختیار کیا اور اس پہ کوئی بحث نہیں چھیڑی تو تم بھی سکوت اختیار کرو اور دوسروں کو بھی سکوت اختیار کرنے دو۔ اس قول نے واثق کا ذہن یکسر بدل دیا اور مدتوں کا پھیلا ہوا انتشار ختم ہوگیا۔ ہماری

پوری کی پوری تاریخ واقعاتی شہادت صرف اس بات پر بہم پہنچاتی ہے کہ مسلمانوں میں ہمیشہ ترکِ سنت سے انتشار پیدا ہوا اور قبول سنت نے سب کو جمع کر دکھایا۔

اقبال کے یہ اشعار پڑھیے اور پھر تاریخ کا مطالعہ فرمائیے :۔

از رسالت در جہاں تکوینِ ما — از رسالت دینِ ما، آئینِ ما

از رسالت صد ہزار ما یک است — جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است

از رسالت ہم نوا گشتیم ما — ہم نفس، ہم مدعا گشتیم ما

یہ آپ کی قوم کے اس بصیرت مند شخص کا ذہن ہے جسے آپ حکیم الامت اور شاعرِ مشرق کہہ کہہ کر فخر کرتے ہیں۔ وہ آپ کو بتاتا ہے کہ رسالت اور اس کا اسوہ اور اس کی سنت وہ طاقت ہے جو ہماری تکوین کا وسیلہ ہے، جو ہمارے صد ہزار افراد کو ملا کر ایک ملت بناتی ہے، جو ہمارے اجزا کو باہم دگر لاینفک کر دیتی ہے، جو ہمیں ہم نوا، ہم نفس اور ہم مدعا بناتی ہے۔ واضح رہے کہ یہاں فیضانِ رسالت سے محض قرآن مراد نہیں ہے بلکہ قطعی طور پر سنت مراد ہے۔ کیونکہ آپ کے اس حکیم الامت نے آگے تصریح کر دی ہے کہ "فرد از حق، ملت از وے زندہ است"۔ یعنی خدا تعالیٰ پر ایمان اور اس کے وحیٔ کردہ قرآن کا اتباع کر لینا فرد کو اسلامی زندگی کے سانچے میں ڈھالتا ہے، لیکن افراد کو جوڑ کر اور ان کے اختلافات کو ختم کر کے ایک امت میں بدلنے والی طاقت رسالت اور اس کی سنت کی طاقت ہے۔

سنت اور تجدد | فرید جعفری صاحب کو اپنی تاریخ کے بارے میں یہ جامع سا سرسری تصور بھی حاصل نہیں ہو سکا کہ خلافتِ راشدہ کے سقوط کے بعد بادشاہت کا ظہور ہمارے اہلِ سنت اور متجددین کی کشمکش میں متجددین کے برسرِ اقتدار آجانے سے ہوا ہے اور بعد کے تمام فتنوں کی ذمہ داری "سنت" پر نہیں بلکہ "تجدد" پر عائد ہوتی ہے۔ تجدد نے ہمارے ہاں نت نئے گل کھلائے ہیں اور سنت کا پارٹ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اس نے ہر غیر اسلامی نظریے اور اقدام کے خلاف ملت کے اندر سے صدائے احتجاج ابھاری ہے۔ کیا یزید اور حجاج اور ابن ہبیرہ ...... جیسے بادشاہ حاملینِ سنت تھے اور یہ تجدد کے خلاف معرکہ آرا رہے ہیں؟ اس طرح کے لوگ قرآن اور سنت دونوں سے بے پروا ہو کر ایسی کارروائیاں کرتے رہے ہیں

جنہوں نے ساری تاریخ کو آلودہ کر دیا۔

البتہ ایسی مثالیں آپ ضرور پیش کر سکتے ہیں کہ ہمارے اس طرح کے بادشاہوں نے جاہ پسند اور بزدل علماء کو ساتھ لے کر ان کو اپنے مقاصد میں خوب خوب استعمال کیا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ علماء سُو نے ان کے اقتدار کی پاسبانی احادیث پڑھ پڑھ کر اور سنتِ رسولؐ کو پیش کر کر کے کی ہوگی۔ لیکن یہ ظلم تنہا سنت پر ہی نہیں، خود قرآن پر بھی برابر برابر حد تک توڑا جاتا رہا ہے۔ یہ چیز اگر ترکِ سنت کی دلیل بن سکتی ہے تو بدرجۂ اولیٰ ترکِ قرآن کی دلیل بھی بن سکتی ہے۔

قرآن اور سنت کا یہ بے جا استعمال اس بات کا ثبوت نہیں ہوسکتا کہ خود قرآن یا سنت میں کوئی وجہِ فساد موجود ہے بلکہ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کی ہیئتِ اجتماعی کو جب بھی اس کی فطرت کے خلاف کسی ساخت پر استوار کیا جائے گا اور جب بھی کتاب و سنت سے بے نیاز قسم کے متجددین اس پر آکے مسلط ہو جائیں گے تو لازماً ہر پہلو سے اس میں ایسا فساد برپا رہے گا جس میں خیر و برکت کے سرچشمے بھی پوری طرح خیر و برکت بہم نہیں پہنچا سکیں گے۔ بلکہ اُلٹا ان سے انتشار انگیزی کا کام لیا جانے لگے گا۔ اسلامی معاشرہ کی غیر صحت مندانہ ساخت سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو سنت کے سر چپکنا بڑی جسارت ہے۔

دوسری طرف اگر آپ اپنی تاریخ کے کسی ایسے دور کو لیں جس میں کوئی حامل سنت برسرِ اقتدار آگیا ہو تو اس دور میں آپ کتاب و سنت کے خیر و برکت کا بہاؤ پوری طرح محسوس کریں گے۔ مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو ایک مختصر مدت کے لیے کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ آپ اس دور میں ہونے والی اصلاحات اور تبدیلیوں کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ عام لوگوں کے دینی، اخلاقی، معاشی اور انتظامی مفاد کس طرح بحال ہو جاتے ہیں اور شاہانہ جباریوں اور ظالمانہ کارروائیوں اور غیر اسلامی پالیسیوں کا کس طرح خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح کا ہر دور دلیل ہے اس بات پر کہ سنت ہمارے معاشرے کو ہمیشہ اس کی فطرت کے مطابق صحت مندانہ ہیئت پر لے آنے کا ذریعہ رہی ہے اور موجباتِ تفرقہ و انتشار کا خاتمہ کرنے کا وسیلہ بنتی چلی آئی ہے۔

اب ہمیں فرید جعفری صاحب یہ بتائیں کہ انہوں نے کونسی تاریخ ملت پڑھی ہے جس میں انہوں نے سنت کو تفرقہ انگیزی کرتے دیکھا ہے!

ماہرینِ سنت کا اختلاف

پھر فرمایا گیا ہے کہ کوئی دو ماہر رسولؐ کی روایات پر متفق نہیں ہو سکتے!

اول تو یہ بڑی ڈراؤنی سی بات یونہی گھڑ کر ڈال دی گئی ہے اور شاید کسی انتہائی زوال یافتہ دور میں بھی تعبیرِ سنت کے معاملے میں ایسی مضحکہ انگیز کشمکش نہ ملے گی جس کا نقشہ اس عبارت میں کھینچا گیا ہے۔ اختلاف اگر پائے بھی جاتے ہیں تو یہ کوئی انوکھی صورتِ حالات نہیں ہے۔ ہر قانونی نظام میں اسی طرح کا فکری تنوع برسرِ عمل رہتا ہے اور اس تنوع کی وجہ سے ایک نظام مختلف قسم کے حالات کی ذمہ داریوں اور مختلف نوعیت کے جزئی معاملات سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنتا ہے۔ یہ کوئی غیر صحت مندانہ حالت نہیں کہ اس پر تالی پیٹ دی جائے۔ کسی بھی ملک کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوئی سے دو جج اور دو وکیل قانون کے اصولوں کی تعبیر میں متفق نہیں ہو سکتے۔ اب کیا اتنی سی ناگزیر حقیقت کو لے کر یہ اعلان کیا جا سکتا ہے کہ کوئی پیش نظر قانونی نظام ہی ایسا ہے کہ وہ اپنے ماہرین کو متفق ہونے نہیں دیتا۔

دوسری بات یہ سامنے رکھنی چاہیے کہ اگر اختلافات کہیں حدود کو پھاند کر موجبِ تفرقہ بنتے بھی ملتے ہیں تو ان کی اصل وجہ نظامِ حکومت و معاشرہ کا مجموعی فساد ہے۔ ایک ایسی حالت جس میں نہ قرآن کو اپنے اصل مقام پر رکھا گیا ہو، نہ سنت کو اس کا صحیح مرتبہ دیا گیا ہو، بلکہ ساری ترتیب بالکل غیر فطری نہج پر قائم کر دی گئی ہو تو وہاں نہ قرآن اپنے معجزے دکھا سکتا ہے اور سنت اپنی برکات سے معاشرہ کو مالا مال کر سکتی ہے۔ اسلامی نظامِ فکر و قانون کا صحیح چلن اس صورت میں ممکن ہے جب کہ نظامِ تعلیم بہترین نہج پر نئی نسلوں کے ذہن بنا رہا ہو، جبکہ اسلامی مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) میں مسائل باقاعدگی سے زیرِ بحث آ کر کسی اجماعی فیصلے پر منتج ہو رہے ہوں، جبکہ عدالتی نظام اس قانون کو روزمرہ زندگی کے معاملات پر عملاً منطبق کر رہا ہو۔ لیکن جب نظامِ تعلیم کسی نظامِ فکر و قانون کو اٹھا کے اپنی حدود سے باہر پھینک دے، پارلیمنٹوں میں بحث ہو کر اس کے متعلق نقطۂ اشتراک طے نہ کیا جا سکتا ہو اور عدلیہ کے ذریعے اسے عملی زندگی سے وابستہ نہ رکھا جا سکے، بلکہ افراد اپنے طور پر اسے سیکھیں اور سمجھیں اور اسے پھر نظری

بحثوں کا میدان بنانے رہیں تو ایسی صورت میں اختلافات اپنی فطری حدود میں نہیں رہ سکتے۔ یہی وہ حالت ہے جس نے صرف سنت ہی کے دائرے میں نہیں، خود قرآن کی تعلیمات میں بعض ایسی نامطلوب اختلافی بحثیں پیدا کر دی ہیں جن کو آڑ بنا کر اب سارا حملہ سنّت کے خلاف کیا جا رہا ہے۔

ہم اپنے بھائی فرید جعفری صاحب سے التماس کرتے ہیں کہ وہ براہ کرم سنت کے بارے میں ایک بہت ہی بڑی تفرقہ انگیز بحث شروع کرتے ہوئے معاملات کی گہرائی میں جانے کی کوشش کریں۔ ان گذارشات سے مطلوب بحث برائے بحث نہیں اور نہ ان کے پیچھے کسی طرح کا معاندانہ یا متعصبانہ جذبہ کارفرما ہے۔ ہم نے صرف یہ چاہا ہے کہ ہمارے ملک کے ایک مسلمان صحافی کو کم سے کم اس ذمہ داری کا احساس دلایا جائے کہ جب اجماع امت کے خلاف بڑے بڑے دعوے میدانِ بحث میں پیش کرنے ہوں تو ان کے ساتھ دلائل و شواہد کا زور موجود ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہم نے اپنی طرف سے ان بے بنیاد جذباتی دعووں کے بودے پن کو واضح کرنے کے لیے اپنے دلائل و شواہد پیش کر دیے ہیں۔ چاہیے یہ کہ فرید جعفری صاحب اپنے دعاوی پر نظرثانی فرمائیں اور جس شئے کے لیے وہ دلیل نہ رکھتے ہوں اسے واپس لے لیں اور جس شے پر وہ اپنے آپ کو مضبوط استدلال سے مسلح پاتے ہوں اس پر اپنا سرمایۂ استدلال دوسروں کے سامنے رکھ دیں۔ کسی معقول آدمی کو یہ بہرحال زیب نہیں دیتا کہ وہ گروہی تعصبات میں پڑ کر ضدم ضدا پر اُتر آئے اور غلط بات کہہ کر پھر ناک اونچی رکھنے کے لیے غلط بات کو پکڑ کر بیٹھ جائے۔

امریکہ میں پاکستان کے فکری رجحانات کی ترجمانی

(ادارہ)

[امریکہ میں اسلام اور مسلمان ممالک کے لیے جو نئی دلچسپیاں ابھر رہی ہیں ان کے زیر اثر ستمبر ۱۹۵۳ء میں پرنسٹن یونیورسٹی اور کانگریس لائبریری کے اہتمام میں مؤتمر الثقافت الاسلامیہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس بین الاقوامی مجلس میں اسلام اور مسلمان ممالک کے فکری رجحانات کی ترجمانی کرنے کے لیے ایسے ایسے چیدہ چیدہ اصحاب جمع ہوئے جن میں سے بعض کو امریکی حکومت کی طرف سے سفر کی سہولتیں بہم پہنچائی گئی تھیں اور بعض کو اپنی حکومتوں نے خاص طور پر بھجوایا تھا۔ یہاں ہم اجمالاً پاکستانی نمائندوں کے پیش کردہ خیالات کو سامنے لا رہے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ کیسے لوگوں نے آپ کی ترجمانی کی اور کس اسلوب سے ترجمانی کی۔]

(۱)

"پاکستان میں مسلم فکر کے رجحانات" کے عنوان سے جناب مظہر الدین صدیقی صاحب نے جو ادارۂ ثقافت اسلامیہ پاکستان کے ایک عضو ہیں، خطاب فرمایا۔ آپ کا مطالعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ذہن پاکستان میں مذہبی تحکم، ادھر کچے سائنٹفک الحاد، اور کمیونسٹ مادہ پرستی کے رجحانات کے درمیان ایک کشمکشِ مثلث کی حالت سے گزر رہا ہے۔ مذہبی تحکم پسندی کو وہ تین زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ نظریاتی لحاظ سے یہ رجحان اسلامی قانون کی تعبیر کا قطعی حق دیتا ہے۔ سیاسی لحاظ سے یہ ایک ایسے جمہوری نظام کا تقاضا کرتا ہے جس میں عام آدمی ایک بار اپنے حکمران کو عمر بھر کے لیے منتخب کر کے نظامِ اجتماعی پر اثر انداز ہونے کے قابل نہیں رہتا۔ اقتصادی لحاظ سے یہ رجحان معاشرہ کے موجودہ جاگیردارانہ نظام کا حامی ہے اور مزارعین کو مالکانہ حقوق دلوانے پر تیار نہیں۔ پھر صدیقی صاحب یہ واضح کرتے ہیں کہ اختلافی مذہبی مسائل اور قانونی معاملات میں یہ رجحان حدیث کو معیارِ فیصلہ قرار دیتا ہے۔ یعنی جہاں قرآن کی تعبیر میں کوئی اختلاف ہو تو اسے رفع کرنے کا ذریعہ حدیث کو مانا جاتا ہے۔ یہ چیز متوسط عامی مسلمان کے مقابلے میں اہلِ مذہب کی پوزیشن بڑی مستحکم بنا دیتا ہے، کیونکہ عام لوگ قرآن کو تو آسانی سے

پڑھ سمجھ سکتے ہیں لیکن حدیث کے وسیع ذخیرے پر حاوی نہیں ہو سکتے اور اس لیے وہ معاملات میں فیصلہ کن رائے نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد موصوف حدیث کے ریکارڈ کے ناقابلِ اعتماد ہونے پر گفتگو کرتے ہیں بہر حال وہ اس بات کا خاص احساس پیش کرتے ہیں کہ حدیث اہلِ مذہب کی انحصارٹی ہونے کی بنیاد بن سکتی ہے۔

ہیئتِ سیاسی میں یہ رجحان صدیقی صاحب کے مطالعہ کے مطابق سارا زور امام (HEAD OF THE STATE) کے منصب کی اہمیت پر صرف کرتا ہے اور اسے تقریباً مختارِ کل بنانا چاہتا ہے۔ باوجود اس کے کہ شورائیت کو لازم ٹھہرایا جاتا ہے، اس رجحان کے علمبردار امام کو اہلِ شوریٰ کی اکثریت کی رائے کے خلاف جانے کا حق دیتے ہیں۔ یہ رائے ہمارے ہاں شروع سے چلی آرہی ہے کہ صدرِ ریاست کو ویٹو کا حق حاصل ہے۔

صدیقی صاحب اس چیز پر بھی گرفت فرماتے ہیں کہ قانون سازی کے میدان میں مذہبی تحکم کے رجحان پر قائم ہونے والا مدرسۂ فکر یہ کہتا ہے کہ قرآن کے پیش کردہ قوانین اور ہدایات حرفِ آخر ہیں اور ہمیشہ کے لیے واجب النفاذ یہ مدرسۂ فکر انسانی معاشرہ کے بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں سے صرفِ نظر کرکے سوچتا ہے۔ درحقیقت قرآن نے اپنے قوانین کی قطعیتؔ کا سرے سے ادعا ہی نہیں کیا۔ موصوف کی نگاہ میں قرآن کا دینِ کامل تو بس زندگی کے لیے خدا پرستانہ زاویۂ نگاہ اور چند بنیادی اخلاقی قدروں پر مشتمل ہے۔

اب ادھ کچرے سائنس دانوں کی باری آتی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ ناقص ذہانت کے ساتھ مذہب کو محو کرنے کی تدبیریں سوچتے ہیں، کیونکہ وہ مذہب کو اندھے معتقدات اور اوہام کا مجموعہ سمجھنے کی وجہ سے سائنٹفک زاویۂ نگاہ سے متصادم پاتے ہیں۔ صدیقی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ گروہ سرے سے مذہب کو، اور خصوصاً اسلام کو جانتا ہی نہیں۔ ورنہ اسلام اہلِ عرب کو حقیقت پسند بنانے اور اوہام سے آزاد کرانے کا تجربہ پیش کر چکا ہے۔ اسلام کچھ زیادہ آخرت پسند نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس اس نے اپنے پیروؤں کو بہت مادیت پسند بنا کے دکھایا ہے

صدیقی صاحب کی نگاہ میں کمیونسٹ دہریت بہت زیادہ سائنٹفک اور عقلی ہے، نیز یہ مذہبی اعتقاد کی طرح لوگوں کو ایک تحریکِ نو دینے کے قابل بھی ہے۔ چنانچہ یہ اپنا کام کر رہی ہے۔ اسلام کو ایک

ؔ صدیقی صاحب نے حدیث پر تو پہلے ہی ہاتھ صاف کر دیا تھا، یہاں آکر قرآن کا قلادہ بھی گردن سے اتار دیا۔

از کار رفتہ تصور یا محض مابعد الطبیعیاتی معتقدات کا مجموعہ بنا دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ دہریت مسلمانوں کے ذہن کو کھینچ رہی ہے۔ اس کشمکش شامت سے نجات پانے کی شکل صدیقی صاحب یہ تجویز کرتے ہیں کہ اسلامی تصورات اور اس کے سیاسی و معاشی نظام کی وسیع تر تعبیر نو کی جائے اور جامد مذہبی طبقات کو از سر نو تعلیم دی جائے۔ اس حل کو چھوڑ کر اگر اسلام کے سیاسی و معاشی نظام ہونے کی حیثیت کا انکار کیا گیا تو وہ خلا پیدا ہوگا جسے بھرنے کے لیے فوراً کمیونزم لپکے گا۔ فرماتے ہیں کہ مسلم ممالک کے سامنے سیکولر جمہوریت اور کمیونزم میں ایک کے انتخاب کا سوال نہیں کمیونزم اور وسیع الظرف تصور اسلام میں سے ایک کو چن لینے کا سوال ہے۔

اب آپ ڈاکٹر فضل الرحمٰن لکچرر ڈرہم یونیورسٹی لنڈن (۲) کے خطاب بعنوان "اسلام میں جدید فکر" سے کچھ استفادہ کریں یہ خطاب ہمارے اندر نشوونما پانے والی تحریک جدیدیت (MUSLIM MODERNISM) کے جائزہ پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تحریک کے اولین علمبردار کی حیثیت سے امام ابن تیمیہ کو پیش کیا ہے جن کے مکتب خیال نے وہابی تحریک کی صورت اختیار کی۔ اس کے بعد شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے نام آتے ہیں۔ اب ڈاکٹر صاحب کے سامنے جدید دور آجاتا ہے جبکہ مغرب اثر انداز ہونے لگا۔ اس دور میں سے وہ دو ائمہ جدیدیت کے نام پیش فرماتے ہیں۔ ایک سر سید احمد خاں دوسرے جسٹس امیر علی۔ سرسید کے متعلق بتایا ہے کہ وہ نہ صرف اہل فقہ کے روایاتی مدارس فکر کی، بلکہ مجموعی طور پر حدیث ہی کی اتھارٹی کے منکر تھے۔ جسٹس امیر علی کے بارے میں یہ رائے دی گئی ہے کہ انہوں نے اسلام کو دور جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ، دانش ترقی اور سائنٹفک کلچر کا علمبردار بنا کر پیش کیا۔ پھر اجمالی تذکرہ جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہٗ کا کیا ہے ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں جدید تصور اسلام کا پہلا فلسفی صحیح معنوں میں اقبال ہے۔ اس نے اپنے فلسفۂ عمل کی روح صوفی شعرا سے لی اور پھر اسے نطشائی اور برگسانی افکار کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا۔

اسی ضمن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے کام پر بھی ڈاکٹر صاحب نے اظہار رائے کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ وقت کی ایک تحریک وہ ہے جسے ابوالاعلیٰ مودودی چلا رہے ہیں۔ اس کا جوہر مرکزی مغربی جمہوریت کو مسترد کر کے پاکستان کو ایک مذہبی حکومت میں بدلنا ہے۔ مودودی صاحب کا وسیع لٹریچر اور ترجمان القرآن نامی ماہنامہ بڑا منطقی زور رکھتا ہے لیکن اس کے اندر بعض بنیادی مغالطے شامل ہیں۔ نیز وہ اصلیت کے لحاظ سے منفی نوعیت کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں ضرورت ایک ایسی تحریک کی ہے جو اسلام کو چند روحانی اقدار کا مخزن قرار دے کے چلے جن کے بل پر مستقبل کی ترقی عمل میں آسکے۔ مگر ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر بات ختم کرتے ہیں کہ عملاً ایسی تحریک کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

مطبوعات

ترجمہ بلوغ المرام | مرتبہ علامہ ابن حجر عسقلانی ـ شائع کردہ: نور محمد کارخانہ، تجارت کتب آرام باغ روڈ کراچی قیمت آٹھ روپے۔

بلوغ المرام سولہ سو احادیث کا مجموعہ ہے اور اسکی ترتیب و تبویب فقہی اسلوب پر کی گئی ہے تاکہ احادیث سے احکام اخذ کیے جائیں۔ اس مشہور کتاب کا اردو ترجمہ ہمارے سامنے ہے جو مع متن شائع ہوا ہے مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کے قلم سے فاضل مؤلف کا تعارف اور مولانا خیر محمد صاحب جالندھری کے قلم سے احادیث کی اصطلاحات اور اقسام پر ایک مفید جدول شامل ترجمہ ہے۔ ترجمہ سیدھا سادا اور خاصا رواں ہے۔ حواشی میں ضروری نکات کی شرح کردی گئی ہے۔ کتابت وطباعت کا معیار بہت پسندیدہ ہے دینی رجحانات رکھنے والے نوجوان طلبے کیلیے بہت مفید ہے۔

تازیانے | مولفہ:- احمد بن محمد الیحی ـ مترجمہ:- مولانا ابوالبیان حماد ـ شائع کردہ: نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی قیمت مجلد مع رنگین گرد پوش تین روپے ـــ عربی زبان میں دینی و اخلاقی اقوال وکلمات کا ایک مجموعہ "المنبہات" کے نام سے موجود تھا، یہ اسی کا اردو ترجمہ ہے۔ اس مجموعہ میں آیات و احادیث، بزرگوں اور ادیبوں کے اقوال اور اشعار جمع ہیں۔ تبویب اس طرح ہے کہ پہلے دو دو نکات والے، پھر تین والے، چار والے، علیٰ ہذا القیاس آخر میں دس نکات والے اقوال وکلمات پیش کیے گئے ہیں۔ عربی زبان کے طالب علموں کے لیے تو بہت مفید چیز ہے لیکن وعظ و تصنیف کے کام میں بھی مدد دے سکتی ہے۔ اسے چونکہ ادبی اور واعظانہ نقطۂ نظر سے مرتب کیا گیا ہے لہٰذا نہ تو احادیث کا، اور نہ دوسرے اقوال کا اسنادی جائزہ لیا گیا ہے۔ رطب و یابس سب کچھ جمع ہے۔ مترجم صحیح دینی تصور سے آراستہ اور عربیت اور اردو ادب کے ذوق سے آشنا ہیں۔ چیدہ چیدہ حصص دیکھنے پر ترجمہ با محاورہ اور رواں معلوم ہوا۔ البتہ کہیں کہیں ترقی کی گنجائش ہے۔ مثلاً قول ۵ (ص ۲۵) میں "راس المال" کا ترجمہ "اصلی مالیت" کے الفاظ سے کیا گیا ہے، حالانکہ "سرمایہ" یا "سرمایۂ کار" وغیرہ کے الفاظ زیادہ موزوں تھے۔ حدیث ۳۵ (ص ۱۲) کے ترجمے میں یوم لاظل الاظلہ کا پورا ٹکڑہ حذف ہو گیا ہے۔ طباعتی معیار متوسط اچھا!

جیل خانہ | مرتبہ سید نقی علی۔ ناشر: گوشۂ ادب، انارکلی، لاہور۔ قیمت مجلد مع رنگین گرد پوش تین روپے۔

سید نقی علی صاحب وہ تاریخی شخصیت ہیں جسے مولانا کے ساتھ "قادیانی مسئلہ" کے ناشر ہونے کے

جرم میں مارشل لاء (۱۹۵۳ء) کے تحت فوجی عدالت نے ۹ سال قید بامشقت کی سزا سنائی تھی۔ راہِ حق میں اس قید بامشقت کے تجربے سے گذرتے ہوئے سید صاحب نے عالمِ زنداں کا بڑا گہرا مطالعہ کیا اور اب حاصلِ مطالعہ ہمارے سامنے ہے۔ جیل کی زندگی پر بہت لوگوں نے لکھا ہے مگر سید نقی علی صاحب نے ایک نئی راہ پیدا کی ہے یعنی جیل کی اصطلاحات کا لغت اس انداز سے مرتب کر دیا ہے کہ حیاتِ زنداں کا ایک ایک پہلو سامنے آگیا ہے پیشکش کے الفاظ کی روشنی میں یہ کتاب اُن لوگوں کے لیے ایک طرح کی گائڈ قرار پاتی ہے جن کو آزادی اور دینِ حق کی خاطر آئندہ اس مرحلۂ شوق سے گذرنا ہوگا۔ طباعتی معیار اعلیٰ۔

فتنۂ پرویز و حقیقتِ حدیث | مولفہ: ایم عبدالرحمٰن خاں صاحب۔ ناشر: ایم ثناءاللہ خاں، ریلوے روڈ لاہور قیمت تین روپیہ ـــــ حدیث پر متجددین کا حملہ اس لحاظ سے موجبِ خیر بھی ہو رہا ہے کہ اس کے ردِّ عمل کے طور پر حدیث کی حقیقت اور اس کی دینی اہمیت پر مفید لٹریچر سامنے آرہا ہے۔ یہ کتاب بھی فتنۂ انکارِ حدیث کے رد اور حدیث کی قدر و قیمت کی توضیح میں لکھی گئی ہے۔ منکرینِ حدیث کے ذہن خصوصاً پرویزی مدرسۂ فکر کا تجزیہ ضروری اقتباسات جمع کرکے کیا گیا ہے۔ بہت سی باتیں معلومات افزا ہیں۔ کمی صرف ایک ہے، یہ کہ اندازِ بیان حکیمانہ اور سنجیدہ ہونے کے بجائے مناظرانہ رنگ اختیار کر گیا ہے۔ اور اس طبقے کو متاثر کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا جو درحقیقت پیشِ نظر فتنے کی زد میں ہے۔

آئینۂ تاریخ (حصہ اول) | مرتبہ: جناب افضل حسین ایم اے۔ بی ٹی۔ شائع کردہ مکتبہ جماعتِ اسلامی (ہند) رامپور قیمت ۱۲

جماعتِ اسلامی ہند نے اپنے اسلامی نظریۂ تعلیم کے تحت درسیات کی ترتیب و اشاعت کا جو تیز رفتار کام شروع کر رکھا ہے یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ بھارت کی تاریخ کی چند جھلکیاں (دورِ قدیم سے خاندانِ تغلق تک) اس میں بالکل جدید اسلوب سے دکھائی گئی ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ کے مروجہ مفروضی اور قوم پرستانہ دونوں زاویہ ہائے نظر کو چھوڑ کر اس میں اصولی و مقصدی زاویۂ نظر اختیار کیا گیا ہے۔ ہمیں جناب مرتب کی صلاحیتوں کی وسعت پر حیرت ہے کہ کس خوبی سے اشخاص و واقعات کے ساتھ فکر و تمدن کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ ہر ابھرنے والی طاقت کی صلاحیتیں بھی سامنے آجاتی ہیں اور اس کے زوال کے اسباب بھی۔ مؤلف نے ہر طاقت پر تنقیدی نگاہ ضرور ڈالی ہے مگر اندھے تعصب کا کہیں بھی مظاہرہ نہیں کیا اور نہ دوسری اقوام کے بزرگوں کے لیے کوئی ناگوار لفظ استعمال کیا ہے۔ مسلمان حملہ آوروں کی کامیابی کے اسباب (ص ۹۵) نیک دل سلطان (ص ۱۰۲) بادشاہ کے مقابلے میں قاضی مغیث کی حمایتِ حق (ص ۱۱۳)

بڑے موثر مباحث ہیں۔ جن مقامات پر کہانی کا اسلوب پیدا کیا گیا ہے، وہ تعلیمی نقطۂ نظر سے خاصے کامیاب حصے ہیں۔ مقصدیت کا رنگ کہیں بھی اپنی حد سے بڑھ کر پروپگنڈے کی سطح تک نہیں پہنچا۔ کاش کہ پاکستان کے محکمہ ہائے تعلیم ایسی کتابوں کو داخل نصاب کریں۔

عفت | مرتبہ جناب حمیدہ بیگم بی اے۔ ناشر راشد حمید ناظم ادارہ خواتین، اچھرہ، لاہور۔ قیمت عه/

یہ مجموعہ ہائے مضامین کا ایک نیا سلسلہ ہے جو خواتین کی ضروریات کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے دو حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ پاکستانی خواتین کے لیے اردو میں یوں بھی جو لٹریچر شائع ہو رہا ہے، وہ ضروریات اور تقاضوں کے لحاظ سے ناکافی ہے، لیکن یہ حالات کہ جنہوں نے مسلمان عورت کو دوراہے پر لا کھڑا کر دیا ہے، ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کوئی قابل ذکر کام نہیں ہو رہا۔ ادارۂ خواتین نے اس خلاء کو محسوس کرتے ہوئے عفت کے نام سے جو سلسلۂ اشاعت شروع کیا ہے اس کا ہم بڑی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ عفت کے پیچھے خالص اسلامی ذہن کام کر رہا ہے، مگر وہ ایسا ذہن نہیں جو وقت کے تقاضوں سے غافل ہو۔ ان مجموعوں میں ایک رسالے کا سا تنوع بھی ہے اور پھر ادبی معیار بھی حوصلہ افزا ہے۔ خصوصاً خواتین کے لکھے ہوئے اپنے جو مضامین نظم ونثر ان میں آئے ہیں ان کو دیکھ کر نئی توقعات پیدا ہوتی ہیں۔ کتابت، طباعت، سرورق بہت خوب!

ہماری دنیا | مرتب: نقی علی و محمد یوسف صاحبان۔ ناشر: ادارۂ الحبیب، ۴۹ مین بازار، اچھرہ، لاہور۔ قیمت چھ آنے

بچوں کے لیے مجموعہ ہائے مضامین کا یہ سلسلہ اپنے دو حصے سامنے لا چکا ہے۔ بچوں کی دنیا بھی ابھی تک اچھے مقصدی لٹریچر کی محتاج ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ ان مجموعوں میں معلوماتی، تفریحی اور مقصدی تینوں قسم کے اجزاء موجود ہیں اور اصل زمین اسلامی فکر ہے۔ توقع ہے کہ یہ کوشش قبولیت حاصل کر سکے گی۔ ٹائیٹل تو بہت ہی شاندار ہے۔

مرأة المسلم | مرتبہ: حکیم عبدالرحمٰن ہاشمی۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جماعت اسلامی، گول چوک سرگودھا۔ قیمت ۱۰/

یہ ایک مختصر مجموعۂ احادیث ہے جسے پڑھ کر ایک عام مسلمان دین برحق کے ناگزیر فکری و اخلاقی تقاضوں کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ احادیث صحیح اور مستند لی گئی ہیں اور متن کے ساتھ ساتھ ترجمہ دیا گیا ہے۔ شروع میں علم حدیث کے مبادی اور اقسام احادیث کا اجمالی بیان دیا گیا ہے اور حدیث کے حجت شرعی ہونے پر استدلال کیا گیا ہے

اہم فنی اصطلاحات کی توضیح بھی کردی گئی ہے۔ یہ مجموعہ نہ صرف جماعت اسلامی کی تربیت گاہوں میں بطور نصاب کام دے سکتا ہے، بلکہ مسلمان نوجوانوں کے لیے بہت ہی مفید ہے۔

نصاب حدیث مرتبہ مولانا معین الدین صاحب۔ شائع کردہ: جماعت اسلامی، ملتان۔ قیمت ۳ر

یہ بھی احادیث کا ایک مختصر مترجم مجموعہ ہے اور اسی مقصد کو پورا کرتا ہے جو اوپر کے مجموعے میں کارفرما ہے۔ یہ نسبتہً زیادہ مختصر ہے۔

JAMA'AT-E-ISLAMI. مرتبہ: چوہدری علی احمد خاں۔ شائع کردہ: مکتبۂ جماعت اسلامی، ۲۰۵ نواب پور روڈ ڈھاکہ۔ قیمت ۲ر

انگریزی زبان کا یہ پمفلٹ جماعت اسلامی کا مختصر مگر جامع تعارف نامہ ہے۔ جماعت کی دعوت، طریق کار، لٹریچر، شعبۂ خدمتِ خلق، ہیئت انتظامی، مالیات، شعبۂ تربیت، شعبۂ خواتین، منشور اور اس کی تاریخ کو چند صفحات میں پیش کر دیا گیا ہے۔ جو لوگ جماعت کو براہِ راست سمجھ کر رائے قائم کرنا چاہیں ان کے لیے یہ بہت مفید چیز ہوگی۔

(بقیہ اشارات)

جھنبیلیوں اور ان کے سازشی جوڑ توڑ سے نجات مل سکتی ہے۔ یہ انتخابات چونکہ ملک کے مستقبل کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہونگے لہٰذا ہر نظریہ اور ہر مکتبِ خیال اپنا آخری زور صرف کر دے گا اور اس کھلی مسابقت میں انشاء اللہ اسلامی نظریہ ایک مضبوط طاقت ثابت ہوگا۔ قوم جن لوگوں کے اندر اسلام سے گریز کے رجحانات کا تجربہ کر چکی ہے اُن سے نجات پانے اور زیادہ مخلص اور قابلِ اعتماد لوگوں کو آگے لانے کا یہ ایک بہترین موقع ہوگا۔ پھر جو عوام کی منتخب کردہ نئی دستوریہ کام کرنے بیٹھے گی وہ کبھی بھی رائے عام سے بے نیاز ہو کر کام کرنے کی جسارت نہیں کریگی۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ وہ کوئی غیر اسلامی دستور ملک کے اوپر ٹھونسنے کے منصوبے پیش نظر رکھے۔ وہ نہ صرف پچھلے مسودے کے متفق علیہ اسلامی اجزا کو قبول کرے گی بلکہ ان میں جو کوتاہیاں چھوڑی گئی ہیں ان کو بھی پورا کرے گی۔ ضرورت اس کی ہے کہ دستور سازی کا سارا کام رائے عام کے زیر اثر ہو۔

ایک خاص طبقے کے بعض لوگ کچھ اور ہی نیتوں کے ساتھ اس پیچیدہ صورت حالات سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کی خواہش پنہاں یہ ہے کہ کسی طرح اس ادلا بدلی میں ملک کو دستور کے اسلامی اجزا سے محروم کر دیا جائے۔ ہمارے یہ اکابر مسلمان خصوصیت سے "کتاب و سنت" کے الفاظ پر اندر ہی اندر بہت کڑھ رہے ہیں۔ انہی بڑے بڑے مرتبے کے مسلمانوں کا ذہن ہے جو کبھی کراچی "ٹائمز" اور کبھی "پاکستان اسٹینڈرڈ" کے اداریوں میں کھولتا ہوا سامنے آتا ہے۔ اپنے ان بھائیوں کو ہم خیرخواہانہ جذبے کے ساتھ متنبہ کرتے ہیں کہ رائے عام کے خلاف اس طرح کی سازشیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گی، بلکہ وہ جتنا کچھ لوگوں سے سلب کرنے کی کوشش کریں گے اس سے زیادہ اُن کو واپس کرنا پڑے گا۔ وہ اپنی مجالس میں بیٹھ کر جیسے چاہیں رنگ جمالیں، عوام میں اُن کے رجحانات کی کوئی کھپت نہیں ہے۔ اس کا اندازہ وہ اس ہمہ گیر ردِ عمل سے کر سکتے ہیں جو "سنت" پر فرید جعفری صاحب کے حملے کے زیرِ اثر پاکستان کے دونوں خطوں میں ظاہر ہو رہا ہے۔ آپ حضرات کا تصورِ اسلام کچھ بھی ہو، اجتماعی نظام تو بہرحال اجتماعی تصور ہی کے تحت چلے گا۔ اگر پاکستان کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کتاب و سنت کو فکر و عمل کی اساس اور زندگی کی ہدایت کا سرچشمہ مانتی ہے تو پاکستان کا دستور تو اکثریت ہی کے ایمان کے مطابق تشکیل پائے گا، چاہے اونچے سیاسی شیش محلوں میں زندگی بسر کرنے والے چند افراد کو کتاب و سنت کے الفاظ سے کتنی ہی شرم کیوں نہ محسوس ہو۔ یہ ملک سنت کا انکار کرنے والوں کا ملک نہیں ہے اور یہ ریاست رسول اللہ صلعم کے ارشادات اور عملی کردار کے مخالفین کی ریاست نہیں ہے۔ یاد رکھیے کہ ایک بار "کتاب و سنت" پر پیمان باندھ لینے کے بعد آپ حضرات نے اگر اس پیمان کو واپس لینے کی کوشش کی تو آپ کا اخلاص قطعی طور پر مشتبہ ہو کر رہ جائے گا۔

آج کے بچے کل کے رہنما ہیں

اگر کسی ملک کے مستقبل کا اندازہ کرنا ہو تو اسکے بچوں کو دیکھا جاتا ہے کہ انکی اٹھان کس نہج پر ہو رہی ہے بچوں کے ذہن پر بچپن میں جو نقش بٹھا دیئے جاتے ہیں آئندہ زندگی میں وہی انکی سیرت و کردار کی بنیاد بنتے ہیں۔ اگر آپ پاکستان کو ایک مثالی اسلامی مملکت دیکھنا چاہتے ہیں تو اپنے بچوں کے دل و دماغ کو اسلام کے رنگ میں رنگیئے۔

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اس مبارک کام میں آپکی امداد و رہنمائی اور بچوں کی اسلامی و اخلاقی تربیت کے لئے نہایت سادہ دلنشین اور موثر پیرایہ میں۔ لکھی ہوئی حسب ذیل چیزیں پیش کرتا ہے۔

بچوں کے لئے اصلاحی و اخلاقی کہانیاں

- آسان کہانیاں ۰ ٥ ۰
- اخلاقی کہانیاں پہلا حصہ ۰ ٥ ۰
- اخلاقی کہانیاں دوسرا حصہ ۰ ٥ ۰
- اخلاقی کہانیاں تیسرا حصہ ۰ ۴ ۰
- اخلاقی کہانیاں چوتھا حصہ ۰ ۴ ۰
- مجاہد کی ڈائری ۰ ٥ ۰
- کون ہے راجا ۰ ٥ ۰
- سچ ہے بھئی سچ ہے ۰ ٥ ۰
- ہاضمے کا چورن ٥ ۰
- سورج کا پیام ۰ ٥ ۰
- طوطوں کی رٹ ۰ ٥ ۰
- رحمت کا فرشتہ ۰ ٥ ۰
- دس سیر لکڑیاں ۰ ٥ ۰
- بھوک ۰ ٥ ۰
- سچی کامیابی ۰ ٥ ۰
- پکی حویلی ۰ ٥ ۰
- حسناتی نظمیں پہلا حصہ ۰ ٥ ۰
- حسناتی نظمیں دوسرا حصہ ۰ ٥ ۰
- مرغ کا سالن ۰ ٥ ۰

قرآنی قصے بچوں کی زبان میں

- غار والے ۰ ٥ ۰
- کاؤں والے ۰ ٥ ۰
- سنیچر والے ۰ ٥ ۰
- اللہ میاں کی اونٹنی ۰ ٥ ۰
- جنت سے زمین پر ۰ ٥ ۰
- بیٹے کو نصیحت ۰ ٥ ۰

اللہ کے پیارے نبیوں کے مختصر حالات

سادہ اور دلنشین زبان میں

- نبیوں کے حالات حصہ اول (حضرت آدم سے حضرت ہود تک) ۰ ٥ ۰
- نبیوں کے حالات حصہ دوم (حضرت صالح سے حضرت لوط تک) ۰ ۸ ۰
- نبیوں کے حالات حصہ سوم (حضرت یوسف علیہ السلام) ۰ ۸ ۰
- نبیوں کے حالات حصہ چہارم (حضرت موسیٰ) ۱ ۸ ۰
- پیارے رسول (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ۰ ۸ ۰

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ - لاہور

مجموعہ تفاسیر فراہی

تالیف : مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ : مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا حمید الدین فراہی اس دور آخر میں تفسیر کے امام گذرے ہیں۔ انہوں نے قرآن پر فکر و تدبر کی نئی راہیں کھولیں اور اس کی وہ مشکلیں حل کیں جو اب تک تفسیر کی کتابوں میں حل نہیں ہو سکی تھیں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اصل تفسیر عربی میں ہے۔ اس کے جو اجزاء شائع ہو چکے تھے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد خاص

مولانا امین احسن اصلاحی

نے ان کا شستہ اور شگفتہ اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اور شروع میں مصنف کے مختصر حالات زندگی بھی دے دئے ہیں اور مولانا حمید الدین فراہی کے مقدمہ تفسیر کا ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے جو اصول تفسیر پر مولانا کے قلم سے ایک نہایت جامع رسالہ ہے۔ اس مجموعہ میں مقدمہ تفسیر کے علاوہ مندرجہ ذیل سورتوں کی تفسیروں کے ترجمے شامل ہیں:۔

تفسیر آیۃ بسم اللہ ‘ تفسیر سورۂ فاتحہ ‘ سورۂ ذاریات‘ سورۂ قیامہ ‘ سورۂ تحریم‘ سورۂ عبس‘ سورۂ و الشمس‘ سورۂ و التین‘ سورۂ و العصر‘ سورۂ فیل‘ سورۂ کوثر‘ سورۂ کافرون‘ سورۂ لہب‘ سورۂ اخلاص ۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں سے ہر تفسیر میں قرآن مجید کی ایسی اہم مشکلیں حل کی ہیں جو قرآن کے دوسرے مشکل مقامات کے حل کے لئے کلید کا کام دیتی ہیں اور یہ بات پورے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر ایک شخص مولانا کے مقدمہ تفسیر قرآن کی روشنی میں ان تمام اجزاء کا بغور مطالعہ کرے تو وہ مولانا فراہی کے اسلوب فکر سے اچھی طرح آشنا ہو جائیگا اور قرآن پر محققانہ تدبر کے لئے اپنی راہیں خود کھول لیگا ۔

تفسیری حقائق و معارف کا یہ مجموعہ ٢٥٢ صفحات ٢٠ × ٢٦ / ٨ سائز پر مشتمل ہے اور اس کے متعلق بلا تکلف یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ اسکا ہر صفحہ تفسیری حقائق کا بیش بہا گنجینہ ہے ۔ کتابت و طباعت نہایت نفیس ۔ جلد عمدہ کپڑے کی .... قیمت : چودہ روپے

تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ پر

نعیم صدیقی (مدیر چراغ راہ) * سعید ملک (مدیر روزنامہ تسنیم)

کا مرتب کردہ

بے لاگ جامع اور مدلل

تبصرہ

شائع ہو چکا ہے ۔ سفید کاغذ اور ٢٠٨ صفحات کے باوجود صرف ایک رو پیہ چار آنے میں ہم سے طلب فرمائیں

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ ۔ لاہور

سرورق جدید اردو ٹائپ پریس ، لاہور میں چھپا